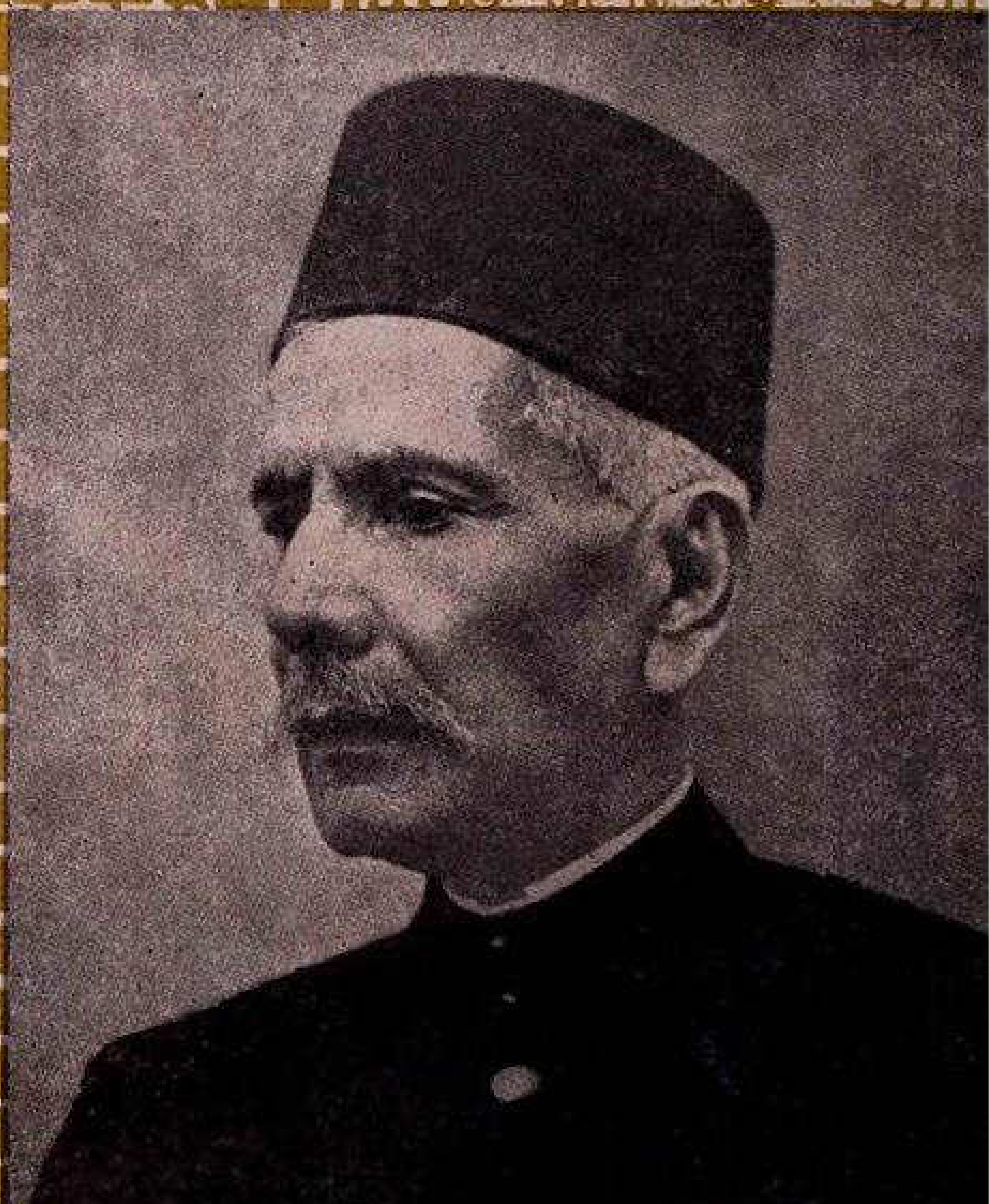
منظوماتِ صفیؔ (حصۂ اوّل



مرتبہ :- سید زائر حسین کاظمی

منظوماتِ صفی

(حصّہ اوّل)

مرتبہ
سیّد زائر حسین کاظمی

یہ کتاب اُتر پردیش اُردو اکاڈمی کے مالی تعاون سے شایع ہوئی

۱۔ ناشر ... ... سید زائر حسین کاظمی
۲۵۳/۲۸ نادان محل روڈ۔ لکھنؤ۔ ۴
۲۔ پرنٹر ... ... سرفراز پریس۔ لکھنؤ
۳۔ کاتب ... ... ظہور احمد لکھنوی
۴۔ سالِ اشاعت ... ... مارچ ۱۹۷۶ء
۵۔ تعداد اشاعت ... ... چھ سو

قیمت ـــــ پندرہ روپیہ

ملنے کا پتہ

۱۔ انوار بک ڈپو۔ امین آباد پارک۔ لکھنؤ۔ ۱
۲۔ کتاب نگر۔ دین دیال روڈ۔ اشرف آباد۔ لکھنؤ۔ ۳
۳۔ اُردو پبلشرز۔ نظیر آباد۔ لکھنؤ۔ ۱

فہرست

مقدمہ

زبان کے چند الفاظ کو موزونیت کے دھاگے میں پرو دینے کا نام شاعری نہیں ہے۔ اگر موزونیت کا نام ہی شاعری ہوتا تو تاریخِ اُردو اُن ہزاروں اور لاکھوں لوگوں کے نام سے بھرپور ہوتی جو فطرتاً موزوں طبع واقع ہوئے تھے اور جن کی زبان کا نکلا ہوا ہر فقرہ ساز اور آواز سے لبریز تھا۔ جن کے جملے مقفیٰ اور مسجع تھے۔ قافیہ بندی جزوِ شاعری ہے لیکن دلیل شاعری نہیں۔ اسی لیے توصفی نے اصلاحیہ طور پر کہا ہے

عاشقی کام نہیں عاشقِ ہرجائی کا
شاعری نام نہیں قافیہ پیمائی کا

شعر میں شعریت پیدا کرنے کے لیے شاعر کو کچھ اور چیزیں تلاش کرنی پڑتی ہیں۔ کبھی اپنے تخیل کے پرواز کے سہارے قومی افتخار کو پروان چڑھانے کی ضرورت ہوتی ہے۔ کبھی حب الوطنی اور قومیت کا جذبہ بیدار کیا جاتا ہے کبھی سماج میں راسخ برائیوں کو دور کرنے کی تدبیر سوچی جاتی ہے کبھی محنت کشوں کے پسینے کی خوشبو سے فضا کو معطر کیا جاتا ہے۔ اسی طرح کے سیکڑوں ایسے انسانی مسائل ہیں جس کو شاعر اپنا موضوعِ کلام بنا کر عوام کے سامنے پیش کرتا ہے۔

ڈاکٹر اقبال اور میر انیس کی شاعرانہ عظمت مسلم ہو چکی ہے۔ ان کی شاعری کا انحصار اس پر نہیں ہے کہ انھوں نے قافیہ اور ردیف کے قید و بند میں رہ کر کس طرح اپنے خیالات پیش کیے ہیں بلکہ ان کی عظمت کا انحصار اس پر ہے کہ انھوں نے عوامی زندگی کا کتنی گہرائی کے ساتھ مشاہدہ کیا ہے اور اُن مشاہدات کے نتائج کو عوام تک کس حسن و خوبی کے ساتھ موثر انداز میں پیش کیا ہے۔ بلند ہمتی سے ہم کنار ہونے اور پست ہمتی سے پرہیز کرنے کی جو آواز اقبال نے اپنی شاعری کے ذریعہ بلند کی تھی وہ عوام کی آواز ہو گئی۔

حریت کو برقرار رکھنے اور ظلم و جور کے سامنے سر خم نہ کرنے کا جو فلسفہ میر انیس نے اپنے مرثیوں میں پیش کیا وہ عوام کا طریقۂ کار بن گیا۔ انھوں نے عام انسان کو اس صداقت سے آگاہ کر دیا کہ آزادیِ ضمیر ایک ایسی طاقت ہے جس پر ظلم و ستم کے فرماں روا ظفریاب نہیں ہو سکتے۔ جسم کے ٹکڑے کیے جا سکتے ہیں لیکن ضمیر کے ٹکڑے نہیں کیے جا سکتے۔ پیکرِ انسانی پر تیغ و تلوار کے کاری زخم لگائے جا سکتے ہیں لیکن روحانی پیکر ان مضرات سے بالاتر ہے۔ یہی اصول ڈاکٹر اقبال اور میر انیس کی شاعری کی روح ہیں اگر بیک یہ شاعری سے اس روح کو الگ کر دیا جائے تو ان کی شاعری بھی دیگر شعراء کے کلام کی مانند بے جان ہو جائے گی۔ شاعر جب ان اصولوں سے منحرف ہو جاتا ہے تو اُس کی شاعری قابلِ اعتنا نہیں رہ جاتی۔ ایک عربی شاعر نے بجا کہا ہے کہ سب سے اچھا شعر وہ ہے جس کو سُننے کے بعد لوگ کہیں کہ سچ ہے۔ دن کو رات کہنا اور رات کو دن، صبح کو شام کہنا اور شام کو صبح شاعری نہیں ہے جادوگری ہے جس طرح ایک جادوگر اپنے جادو کے زور سے غیر فطری واقعات پیش کر کے ناظرین سے خراجِ عقیدت حاصل کر لیتا ہے اسی طرح ایک شاعر بھی الفاظ کے سنہرے جال میں بے بنیاد اور جھوٹ واقعات نظم کر کے قارئین کو محسور کر سکتا ہے اور اُس کو اپنا ہم زبان بنا سکتا ہے۔ لیکن جب الفاظ کا جادوئی اثر زائل ہو جاتا ہے تو سننے والے پھر اپنے مرکز کی طرف واپس آ جاتے ہیں اور چند ساعت پہلے گذری ہوئی باتیں خواب و خیال ہو جاتی ہیں۔ یہی زود اثری شاعری کے منافی ہے شعر سامعین پر بتدریج اثر پذیر ہوتا ہے جس کا قیام ابدی ہوتا ہے۔ میر انیس کے یہ اشعار انھیں ابدی اثرات کو اپنے میں پیوست کیے ہوئے ہیں۔ ؎

در پہ شاہوں کے نہیں جاتے فقیر اللہ کے ۔۔۔ سر جہاں رکھتے ہیں سب ہم واں قدم رکھتے نہیں

کسی کو کیا ہو دلوں کی شکستگی کی خبر ۔۔۔ کہ ٹوٹتے ہیں یہ شیشے صدا نہیں کرتے

خاکساری نے دکھائیں رفعتوں پہ رفعتیں ۔۔۔ اس زمیں سے واہ کیا کیا آسماں پیدا کیے

نمود و بود پہ بشر کیا محیط عالم میں ۔۔۔ ہوا کا جب کوئی جھونکا چلا حباب نہ تھا

ملا جنھیں انھیں افتادگی سے اوج ملا ۔۔۔ اُنھیں نے کھائی ہے ٹھوکر جو سر اُٹھا کے چلے

میر انیس نے یہ اشعار ایک دور سے متاثر ہو کر نظم کیے تھے لیکن اِن کی وسعت کو صرف اُسی دور میں محدود نہیں کیا جا سکتا۔ جس عہد میں بھی یہ شعر پڑھے جائیں گے اُسی عہد کی تصویریں ان میں نمایاں ہوتی جائیں گی۔ ایک صدی سے زیادہ عرصہ گذرنے کے بعد آج بھی ان اشعار کی گیرائی بدستور ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاعر نے ہمارے عہد کے لیے ان کو نظم کیا تھا۔

نثر نگاری اور شاعری میں ایک بیّن فرق یہ ہے کہ جو اثر شعر کے پڑھنے سے ہوتا ہے وہ نثر کے پڑھنے سے نہیں ہوتا۔ اسی لیے عرب میں شاعری کو جادو بیانی کے نام سے بھی تعبیر کیا گیا ہے۔ وہاں ہر قبیلے کا اپنا الگ شاعر ہوتا تھا جس کا کام قبیلے کا مدعا دوسرے قبیلے والوں کے سامنے پیش کرنا تھا۔ ہر موقع پر چاہے وہ خوشی کا ہو یا غم کا شاعری کو برآریِ مطلب کا ذریعہ قرار دیا جاتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ سرزمین عرب پر شاعری کو جو فروغ حاصل ہوا وہ دُنیا کے دوسرے ممالک کی شاعری کو نصیب نہ ہو سکا۔ جس ملک میں شاعری اپنا مطمحِ نظر پیش کرنے کا آلہ بن جائے وہاں پر ہر انسان اس کو اپنانے اور اس میدان میں دوسروں سے سبقت لے جانے کی کوشش کرے گا۔ یہی وجہ تھی کہ عرب کا ہر گھر شعر و شاعری کا مرکز بن گیا۔ اسی لیے قرآن کو بھی فصیح و بلیغ زبان میں نازل کیا گیا اور جب عرب کے شعرا نے قرآن کی آیتوں کی شعریت اور اثر دیکھا تو کہنے لگے کہ یہ انسان کا کلام نہیں بلکہ کلامِ خدا ہے اور پھر اسے اُس زمانے کی مروّج شاعری کا معجزہ قرار دیا۔

شاد عظیم آبادی نے بھی شاعری کی اس خصوصیت کو اس طرح سے پیش کیا ہے۔ ؎

بیاں کرے جو کوئی بات نظم میں اپنی	تو اصل حال کی تصویر کھینچ دے گویا
اثر زیادہ ہو سامع پہ نثر کی نسبت	اسی لیے ہے فقط شعر و شاعری کی بنا

جب شاعری کی بنیاد ہی اثر پر ہے تو اگر کوئی شعر اثر سے خالی ہے تو اُسے کیونکر شعر کا نام دیا جا سکتا ہے۔ اُردو ادب میں ایسے اشعار کثرت سے ملیں گے جن میں اثر کا کوئی شائبہ نہیں۔ اگر ان اشعار کو نثر کی شکل میں تبدیل کر کے پیش کیا جائے تو اِن نثری عبارت میں اشعار سے زیادہ اثر ملے

آئے گا۔ اب یہ مسلّم ہو گیا کہ شعر کا اثر پذیر ہونا ایک لازمی چیز ہے۔

جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ سچی بات ہی دل پر اثر ڈالتی ہے اور یہ اثر غیر فانی ہوتا ہے۔ کبھی کبھی جھوٹ اور بے سروپا باتیں بھی وقتی طور پر اثر انداز ہو جایا کرتی ہیں لیکن ان کے اثرات دیرپا نہیں ہوتے۔ جیسے جیسے جھوٹ کا ملمع اپنی تاب کھوتا ہے ویسے ویسے اُس کا اثر بھی زائل ہوتا جاتا ہے۔ قدیم شاعری میں اس دروغ گوئی سے زیادہ کام لیا گیا ہے۔ اُس وقت کا شاعر اسی میں اپنی شان سمجھتا تھا کہ وہ بے بنیاد واقعات کو الفاظ کے خوب صورت جھرمٹ میں کس طرح نظم کر سکتا ہے۔ مولانا حالیؔ اِس قسم کی شاعری سے اجتناب کرتے ہوئے شاعر کو خطاب کرتے ہیں ؎

وہ دن گئے کہ جھوٹ تھا ایمانِ شاعری قبلہ جواب اُدھر تو نہ کیجیو نماز تو

مولانا حالیؔ نے صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اور آگے بڑھ کر فرماتے ہیں۔ ؎

اے شعرِ دل فریب نہ ہو تو، تو غم نہیں پر تجھ پہ حیف ہے جو نہ ہو دل گداز تو

اِس شعر کے دوسرے مصرعے کا جہاں تک تعلق ہے وہ اپنے مقام پر لاکلام ہے۔ شعر کی تعریف یہی کی گئی ہے کہ وہ نثر کی نسبت زیادہ پُراثر اور دل گداز ہو۔ لیکن مصرعۂ اولیٰ میں جس صفت سے شعر کو مستثنیٰ کر دیا گیا ہے اُس سے بھی شعر کی شعریت باقی نہیں رہتی۔ شعر کو دل فریب بھی ہونا چاہیے اور دل گداز بھی۔ شعر کی دل فریبی شعر کی جان ہوتی ہے۔ کوئی واقعہ پیش کرنے کے لیے اگر مناسب الفاظ کا استعمال مناسب ڈھنگ سے نہیں کیا گیا ہے تو لازمی ہے کہ اس واقعہ کی اہمیت سامعین تک پہنچتے پہنچتے خفیف ہو جائے گی اور پھر شعر کا دل گداز رہنا ناممکن ہو جائے گا۔ مناسب الفاظ اور حقیقی واقعات کا تال میل ہی شاعری کو جنم دیتا ہے۔ اگر کسی شاعر کے یہاں یہ دونوں چیزیں بقدرِ ضرورت موجود نہیں ہیں تو اُس کی شاعری پُراثر نہ ہوگی۔ دل پذیر اور خوبصورت الفاظ کا سہارا لیکر بھی اگر کوئی شاعر غلط اور بے جا واقعات کو شاعری کے پیکر میں پیش کرتا ہے تو یہ شاعری بھی غیر موثر ہوگی۔ جس طرح بیش قیمت نگینے کی انگوٹھی تیار کرنے کے لیے بیش قیمت دھات کی بھی

ضرورت ہوتی ہے یعنی ہیرا اور پنا کا نگینہ آہنی انگشتری پر نہیں جڑا جا سکتا اُسی طرح سے اچھے مضمون کو گھٹیا قسم کے الفاظ میں نہیں نظم کیا جا سکتا۔ شاعری میں مضمون اور طرز بیان لازم و ملزوم ہیں۔ اگر ایک پلہ بھاری اور دوسرا ہلکا ہوگیا تو شعریت کافور ہو جائے گی صرف موزونیت باقی رہ جائے گی۔

شعر کی اس خصوصیت کو کچھ شعر فہم حضرات الفاظ و معنی کے نام سے موسوم کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اگر الفاظ و معنی میں مناسب ربط نہیں ہے تو اُسے شعریت شاعری کے زاویۂ نظر سے شعر نہیں کہہ سکتے۔ ادبا اور نقاد جو بھی نام دینا چاہیں دے سکتے ہیں لیکن شعرا اس کو شعر نہیں کہیں گے۔ ظریف لکھنوی جن کو لکھنؤ کی دبستان شاعری کا نمائندہ کہا جاتا ہے نے اس اصول کے متعلق یوں کہا ہے۔ ؎

ربط الفاظ و معنی میں دگر باہم نہیں   قائل ایسی شاعری کے بندہ پرور ہم نہیں

جب شاعری کی بنیاد الفاظ و معنی میں ربط پیدا کرنا ہی ہے تو پھر یہ خصوصیت ہر شاعر کے یہاں کیوں نہیں ملتی؟ ہر شاعر اپنی صلاحیت کے مطابق کوشش اور خواہش کرتا ہے کہ اُسے شاعری کی معراج حاصل ہو جائے۔ اس کی زبان سے نکلا ہوا ہر شعر زبان زد خاص و عام ہو جائے۔ اس کا شعری مجموعہ آسمانی صحیفوں کی طرح بازار میں ہاتھوں ہاتھ بکنے لگے۔ لیکن ہزاروں میں معدودے چند شاعر ایسے نکلتے ہیں جو کامیابی کی ان منازل تک پہونچتے ہیں اور باقی ایک ایک کر کے راستے کی صعوبتوں کا شکار ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ یہ بڑا دشوار راستہ ہے پھر بھی اس سے کسی شاعر کو مفر نہیں۔ اگر منزل ایک اور راستے جدا ہوں تو بہت سے حضرات کسی نہ کسی راستے سے پہونچ سکتے ہیں لیکن منزل مقصود تک جانے کے لیے اگر واحد راستہ ہے پھر تو ہر مسافر کو اسی راستہ سے ہو کر گذرنا پڑے گا چاہے وہ کتنا ہی دشوار گذار کیوں نہ ہو۔ یہی چیز شاعری میں پائی جاتی ہے۔ ہر شاعر جانتا ہے کہ شاعری کی عظیم منزل تک پہونچنے کے لیے الفاظ و معنی کے ربط کی پُر خار وادی سے ہو کر گذرنا پڑے گا۔ لیکن اس وادی کو پار کرنا آسان نہیں ہے۔ جس طرح خلد بریں میں قیام کرنے کے لیے پل صراط سے

ہو کر گذرنا ہوگا۔ اسی طرح دیوانِ شاعری میں استراحت فرمانے کے لیے الفاظ و معنی کے ربط کی وادی سے گذرنا ہوگا۔ اثر لکھنوی نے اس وادی کی تعریف یوں کی ہے۔ ؎

لفظ و معنی میں ہو وہ ربط لطیف — جیسے گرمی ہو شعلے میں مضمر
اور تاثیر کا یہ عالم ہو — دردمندوں کی آہ وقت سحر

شعر کی یہ خصوصیت اتنی لطیف اور نازک ہے جو ہر کس و ناکس کی شاعری میں نہیں پائی جاتی۔ اس میدان میں وہی کامیاب ہوا جس نے اس کو اپنی شاعری کا سرچشمہ قرار دیا۔ ڈاکٹر اقبال، میر انیس، اکبر الہ آبادی اور صفی لکھنوی ہی اس میدان کے غازی بن سکے۔

لسان القوم مولانا سید علی نقی صفی لکھنوی نے ۹۰ سال کی طویل عمر میں ۳ لاکھ سے زائد اشعار تصنیف کیے۔ بقول علامہ سید اختر علی تلہری "تقریباً ۷۵ سال تک انھوں نے مسلسل شعر و ادب کے باغ کی آبیاری کی۔ اپنے خونِ جگر سے اسے سینچا"۔ اور شاعری کے ہر صنف میں طبع آزمائی کی نظموں کے انبار لگا دیئے۔ تاریخ کے اوراق شاہد ہیں کہ دنیا کی ممتاز ترین ہستیوں میں اکثر و بیشتر ایسی ہیں جنھوں نے صرف ایک یا دو لختِ جگر پیدا کیے۔ جو ان کی عظمت کا سبب بنے۔ لیکن صفی لکھنوی نے ۲۵ "لختِ جگر" اور کئی "نورِ نظر" اپنے بعد چھوڑے جو ان کی شہرت کے تاقیامت ضامن رہیں گے۔

صفی لکھنوی ایک باعمل انسان تھے۔ جس کی تبلیغ کرتے پہلے اس پر خود عمل کر کے کچھ لوگوں کو گواہ بنا لیتے اور پھر دوسروں کو عمل کی دعوت دیتے۔ اپنی نظموں میں جگہ جگہ آپ نے شاعری کے اصول بتلائے ہیں لیکن اُن بتائے گئے اصولوں پر پہلے خود گامزن ہوئے اور پھر دوسروں نے اُن کی پیروی کی۔ آپ نے اپنی شاعری میں الفاظ و معنی کے تناسبِ حقیقی کو ہمیشہ برقرار رکھا۔ نہ الفاظ کا پلہ بھاری ہوا نہ معنی کا۔ یہ انھیں کا دکھایا ہوا راستہ تھا جسے ظریف نے اپنے ایک شعر میں محدود کر دیا۔ آپ نے شاعری کی مختلف زمینوں کی سیر کی۔ کبھی چٹیل میدان ملے، کبھی پُر خار وادیاں، کہیں دلدل نظر آئے کہیں گلستان، کہیں سنگ لاخ ٹیلوں سے مڈبھیڑ ہوئی، کہیں بے آب و گیاہ ویرانوں کا سامنا ہوا لیکن ربطِ الفاظ و معنی کا دامن کبھی نہیں چھوٹا۔ مندرجہ ذیل اشعار میں ان خوبیوں

کو تلاش کیجیے۔ جتنی بار آپ پڑھیں گے ایک نیا لطف سامنے آئے گا۔ شاعر "اگربتی" کی تعریف کرنا چاہتا ہے لیکن اس کو یہ نزاکت بھی گوارا نہیں کہ وہ اپنی زبان سے اس کی مدح سرائی کرے۔ اگربتی اپنی زبانِ حال سے خود کہتی ہے کہ میں نے مختلف قبرگاہوں کی سیر کی ہے۔ کبھی غالب کے مزار پر اشک فشانی کی کبھی بہادر شاہ ظفر کی قبر پر آنسو بہائے۔ کبھی ایک گُم نام مرقد کو معطر کیا کبھی کسی کشتۂ غم کی لحد کو رونق بخشی۔ صفی لکھنوی کی قادر الکلامی دیکھیے اور الفاظ و معنی کے ربط کی داد دیجیے۔ ؎

ہوں سراپا جو معطّر صفتِ صَندل و عُود | فیضِ صحبت نے کیا ہے مجھے عنبر آلود
شمع کا سوز اگر مجھ میں تو ہے گل کی شمیم | خوشگوار ایسی نہ ہوگی کبھی سنبل کی نسیم
ہر ہوا خواہ مجھے لے کے جلا دیتا ہے | کہ مرا دُود جسے گر بوئے وفا دیتا ہے

ماں کی شفقت ایک ایسی نعمتِ خداوندی ہے جس کے نُور کے سائے میں رہنے کے بعد دُنیا کی تاریکیاں بے اثر ہو جاتی ہیں۔ اس کی تعریف میں بہت سے شاعروں نے نظمیں لکھی ہیں۔ صفی لکھنوی نے بھی "آغوشِ مادر" کے عنوان سے ایک مسدس تصنیف کی ہے۔ اس میں جس حُسن و خوبی کے ساتھ جذبات کی ترجمانی کی گئی ہے وہ دوسرے شعراء کے یہاں مفقود نظر آتی ہے۔ الفاظ و معنی اس طرح لازم و ملزوم بنا کر پیش کیے گئے ہیں کہ پڑھنے والا مبہوت ہو جاتا ہے۔ ؎

خاص کر ماں وہ محبت کی مجسم تصویر | آیۂ رحمتِ خالق کی مکمل تفسیر
پرورش کے لیے اولاد کی سرچشمۂ شیر | چارہ سازِ دلِ رنجور بہ حُسنِ تدبیر
پردۂ شیر میں جس نے کہ دکھائے نیرنگ
خون دوڑا کے بھرا بچے کے رنگ میں رنگ

تیری ہستی میں تمام اس کی اُمیدیں محدود | تیری تعلیم کو سمجھے ہوئے اصلِ مقصود
بس یہی فکر کہ حاصل ہو تجھے نام و نمود | خادمانہ تری خدمت کے لیے خود موجود

اپنی راحت پہ مقدم تری راحت اُس کو
وحشت انگیز تری سیر و سیاحت اُس کو

صفی لکھنوی کے کاروانِ شاعری میں ربطِ الفاظ و معانی کے ساتھ ساتھ رنگِ حقیقت بھی ہم سفر رہا۔ کچھ شعرا تخیل کی بلند پردازی میں حقیقت کو فراموش کر دیتے ہیں اور ایسی لغویات نظم کر دیتے ہیں جس کا حقیقت سے کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ اُن کی دلی خواہش ایسی شاعری کو وجود میں لانے کی نہیں ہوتی لیکن وہ اپنے جذبات کے دھارے میں اتنا بہہ جاتے ہیں کہ جذبات اور تخیل کے توازن کو قائم رکھنا اُن کے لیے ناممکن ہو جاتا ہے اور روزمرہ کے مشاہدات اُن کی شاعری میں جگہ نہیں پاتے۔ مگر صفی لکھنوی کی نظموں میں حقیقت جزوِ شاعری بن گیا ہے۔ آپ نے کہیں بھی اس سے انحراف نہیں کیا ہے۔ چاہے مسلسل نظم ہو یا چند مصرعوں کا قطعہ، ہر جگہ اس کا التزام نظر آتا ہے۔

مادیت زمانۂ حاضرہ کی ایک خصوصیت بن چکی ہے۔ چاند و مریخ کا سفر آسان ہو گیا ہے۔ بنی نوعِ انسانی کی تباہی کے لیے چند ہائیڈروجن بم کافی ہیں۔ موت پر قابو پانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ سائنس کی بدولت آج ہر مشکل آسان ہو گئی ہے۔ اتنی ترقی کرنے کے بعد انسان کو اپنے رب العزت کے نزدیک تر جانا چاہیے جس نے اِن تمام معلومات کو سمجھنے کے لیے عقلِ سلیم عطا کی ہے لیکن معاملہ برعکس ہے۔ اس حقیقت سے متاثر ہو کر صفی لکھنوی نے اپنے خیال کی ترجمانی اس شعر میں کی ہے۔ ؎

اِک مشتِ خاک اور پھر اس پر یہ حوصلہ — کرنے لگے ہیں اب تو بغاوت خدا سے ہم

دوسری مثال دیکھیے۔ انسانیت ہر دور میں قابلِ پرستش رہی۔ آدم تا ایں دم اسی کی مدح سرائی ہر پاک ذہن نے کی ہے۔ جب جب انسان نے گمراہی کا راستہ اختیار کیا۔ اللہ کے پیغمبروں اماموں اور ولیوں نے اُس کو راہِ راست پر لانے کی کوشش کی۔ اہلِ علم اور شعرا نے اپنی سحر بیانی سے اُس کے تاریک دل کو منور کیا۔ کبھی زبیر بن ابی سلمہ سامنے آئے۔ کبھی شیخ سعدی مشعلِ راہ

بنے کبھی اقبال نے رہنمائی کی۔ کبھی غالب نے کہا۔ ؎

بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا　　آدمی کو بھی میسّر نہیں انساں ہونا

منوّر لکھنوی نے اپنے اِس شعر میں اسی خیال کو اِس طرح سے پیش کیا ہے ؎

دُور کوسوں تک کہیں انسان نظر آتا نہیں

آج ہیں انسانیت سے دُور انساں سیکڑوں

نشور واحدی کے ان جذبات کو دیکھیے۔ ؎

کہاں آگئی ہے اب نسلِ آدم　　کہ انساں زیادہ انسانیت کم

اِس حقیقت پر مبنی اب صفی لکھنوی کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیے اور خود منصف بن کر فیصلہ کیجیے کہ صفی لکھنوی کی شاعری کس حد تک حقیقت سے ہم کنار ہے۔ ؎

وہ نقطہ جو تھا مرکزِ آدمیت　　بہت دُور اُس سے جدا ہو گئے ہم

صفی رہتے ہیں جان و دل فدا کرنے کو آمادہ　　مگر اُس وقت جب انسان کو انساں دیکھ لیتے ہیں

جہاں جہاں نہیں انسان یعنی انساں　　مری نظر میں وہ آبادیاں ہیں ویرانہ

مولانا حالی نے اصلیت کو جانِ شاعری کہا ہے۔ اُن کے مطابق شعر وہی ہے جو اصلیت پر مبنی ہو۔ اصلیت اور حقیقت دو الفاظ ہیں جو عام طور پر ایک ہی معنی میں استعمال ہوتے ہیں۔ مگر ادبی نقطۂ نظر سے دونوں میں فرق ہے۔ اصلیت کا تعلق ہے وقوع ہونے والے حادثات سے، اور حقیقت کا تعلق فطرت کے اصولوں سے ہے۔ اگر کوئی شاعر سکندرِ اعظم کی فتح اور راجہ پورس کی شکست کو نظم کرتا ہے تو کہنا پڑے گا کہ اُس کی شاعری اصلیت پر مبنی ہے۔ لیکن اگر اس کے خلاف اصل واقعہ کو توڑ مروڑ کر نظم کیا جائے تو اس قسم کی شاعری کو اصلیت سے کوئی سروکار نہ ہوگا۔ مولانا صفی کی شاعری ایسی اصلیت پر مبنی ہے۔ اس بند میں عہدِ مغلیہ کے ایک واقعہ پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ جہانگیر بادشاہ کے بیٹے نے جب لاہور میں اپنی خود مختاری کا اعلان کیا تو نورالدین جہانگیر نے جا کر اس کی بغاوت کو فرو کیا اور اپنے بیٹے کو گرفتار کر کے اُس کی دونوں آنکھیں سلوا دیں۔ ؎

شاہ نورالدین جہانگیر ابن اکبر بادشاہ ۔۔۔ اُس کا فرزند معظم خسروِ زریں کلاہ
باپ سے لاہور میں لڑ کر ہوا تھا جو تباہ ۔۔۔ آنکھیں سلوائی گئیں ہر چند تھا نورِ نگاہ

گُل کدہ ہے یہ اسی شہزادۂ ذی جاہ کا
سچ ہے فانی سب ہیں باقی نام ہے اللہ کا

جونپور ایک شہر اور ضلع ہے جہاں پر شیر شاہ سوری پیدا ہوا تھا۔ (کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ وہ سہسرام میں پیدا ہوا تھا) ایک عرصہ تک سلاطین شرقی کا یہ دارالخلافہ رہا۔ اس بند میں صفی لکھنوی نے اس اصل واقعہ کی تصویر کشی کی ہے ۔

جونپور اے مولد سلطانِ عادل شیر شاہ ۔۔۔ تیرے آثار قدیمہ تیری عظمت پر گواہ
کہہ رہا ہے قلعہ شاہی یہ بحالِ تباہ ۔۔۔ مدتوں تک ہند کی ہم بھی رہے ہیں تخت گاہ

ایک غافل قوم کی کھوئی ہوئی عظمت ہیں ہم
ہم سے عبرت کا سبق لو منظرِ عبرت ہیں ہم

شاعر بڑا دور بیں اور دور اندیش ہوتا ہے۔ اُس کی ظاہری نگاہیں موجودہ دور کے مشاہدات سے دو چار ہوتی ہیں اور دل کی نظریں آنے والے واقعات کا جائزہ لیتی ہیں۔ اسی لیے مرزا عسکری علی خاں یگانہ لکھنوی کہتے ہیں۔ ؎

شاعر کا دل نہیں ہے جام جہاں نما ہے
اس دل کے آئینہ میں دُنیا کو دیکھتا ہے

شاعر پہلے اپنے گرد و نواح کی چیزوں کا مشاہدہ کر کے اپنے زاویہ کی تشکیل کرتا ہے۔ اس کے بعد اپنے مشاہدات کے دائرہ کو وسعت دیتا ہے یہاں تک کہ سارا عالم اُس کے مشاہدے کے دائرے کا ایک نقطہ بن جاتا ہے۔ پھر تو شاعر یہ دعویٰ شروع کر دیتا ہے۔ ؎

بازیچۂ اطفال ہے دُنیا مرے آگے

اس منزل سے گذرنے کے بعد وہ اپنے موجودہ مشاہدات کو گذشتہ واقعات کی کسوٹی پر کستا ہے

اور آئندہ ہونے والے نتائج اخذ کرتا ہے۔ ظریف لکھنوی کے عہد میں انگریزوں کا بول بالا تھا۔ ہر طرف مغربیت چھاتی جا رہی تھی۔ رہن سہن، طعام و قیام سب پر مغربی رحجان حاوی ہو چکا تھا۔ ظریف جو خالص ہندوستانی تہذیب کے پروردہ تھے کیونکر اپنے تمدن کی تاراجی برداشت کرتے۔ عریانیت جو مغربی تہذیب کا سب سے بڑا کارنامہ ہے وہ ہندوستانیوں میں عام ہوتی جا رہی تھی۔ تھوڑی سی انگریزی پڑھنے کے بعد بیشتر ہندوستانی عریانیت کا شیدا ہو گیا تھا۔ ایسے ماحول میں باغیرت اور پردہ نشین مخدراتِ عصمت کا خاموشی کے ساتھ وقت گذارنا مشکل ہو چلا تھا۔ انھیں دقیانوسی کہہ کر تحقیر کیا جا رہا تھا۔ شاعر کی ظاہر اور باطن نگاہوں نے صورت، سیرت، گفتار، کردار لباس، عمل میں جو تغیرات دیکھے اُن کے خلاف آواز بلند کرنا اُس نے اپنا فرض منصبی سمجھا اور آنے والی نسل کو آگاہ کیا۔ ؎

نظر بازو جوانی ہو گی اس کی دید کے قابل — ابھی تو گھٹنیوں چلنے لگا ہے شوقِ عریانی
مساوات اس کو کہتے ہیں نئی تہذیب کیا کہنا — کہ یکساں ہو گئی صورت زنانی اور مردانی

صفی لکھنوی نے جو ظریف کے استاد اور بڑے بھائی تھے اپنی شاعری میں اور واضح طریقے سے اپنے عہد کی تیز آنے والے زمانے کی تصویر کشی کی ہے۔ ہندوستان کی آزادی کے بعد اُردو زبان کو اپنی سُدیشی حکومت سے جو نقصانات ہوئے اُس کی امید شاعر کو نہ تھی۔ ۱۹۴۷ء کے بعد اُردو کے ساتھ غیر ملکی زبان کا برتاؤ کیا جانے لگا۔ وہ اُردو جو عدالتوں اور دفتروں میں مروج تھی اُس کی بیخ کنی کی تدبیریں ہونے لگیں۔ اپنی عمر کے آخری دور میں صفی نے جو کچھ دیکھا اُس سے ان کو بڑی تکلیف ہوئی اور بطور پیش خیمہ یہ اشعار نظم کر دیے۔ ؎

فکر میں اس کو مٹانے کے ہے اک جم غفیر — سخت دشوار ہے اُردو کی بقا میرے بعد
خاص اُردو سے متعلق ہے صفی جس کا نام — یہ زباں اب نہ رہے گی بخدا میرے بعد
دیس سے اُردو زباں کو بھی نکالا جائے گا — تھی صفی جو اک زبانِ مشترک کس سے کہیں

صفی کے ان اشعار میں انفرادی نہیں اجتماعی جھلک ہے اور اسی اجتماعی نقطہ نظر نے صفی کو

کو عمرِ جاوداں بخشی ہے۔ اصل زندگی کا جو بھی فلسفہ پیش کیا، اُس نے مرکز بن کر واقعاتِ عالم کو اپنے دائرے میں لے لیا۔ شاعر کی زبان سے نکلا ہوا ہر لفظ اپنے دَور کی سماجی زندگی کا آئینہ دار بن گیا۔

ہندوستان ہمیشہ سے صلح و آشتی کا گہوارہ رہا۔ یہاں کے شہریوں کی پُرامن زندگی دوسروں کے لیے قابلِ رشک تھی۔ یہی وجہ تھی کہ جب جگر گوشۂ رسول یعنی امام حسینؑ کے سامنے امن و صلح کے سارے راستے مسدود ہو گئے، یزید اور اُس کے حامیوں نے صلح کی شرطوں کو ٹھکرا دیا تو ابنِ فاطمہ نے خواہش کی کہ اُنھیں اپنے اعزا اور رفقا کے ساتھ ہندوستان جانے کی اجازت دے دی جائے جہاں پردہ گوشہ نشین ہو کر زندگی کا باقی حصہ امن کے ساتھ گذار سکیں۔ مگر دلبندِ مصطفےٰ کو کربلا چھوڑنے کی بھی اجازت نہ دی گئی۔ اور جو سانحات وقوع پذیر ہوئے اُس پر انسانیت تا قیامت اشک افشانی کرتی رہے گی۔ لیکن سنہ ۱۹۴۷ء کے قریب ہندوستان کی یہ خصوصیت بھی نذرِ شیطنت ہو گئی۔ فرقہ وارانہ فسادات اتنے ہوئے کہ جن کا شمار بھی ایک مہذب قوم کے لیے باعثِ ننگ ہے۔ ایک فرقہ دوسرے فرقے کی بیخ کنی کا درپے ہو گیا۔ بدطینتی اور کج خلقی اتنی بڑھ چکی تھی کہ برسوں ایک ساتھ رہنے والے پڑوسی بھی ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو گئے۔ انسانیت کے پیر اکھڑ رہے تھے اور باطل مذہب پرستی کے قدم جم رہے تھے۔

صفیؔ لکھنوی اسی سرزمین ہندوستان کا ایک ایسا شاعر تھا جس کی پرورش لکھنؤ کے خوشگوار ماحول میں ہوئی تھی۔ اُس عہد کے لکھنؤ کی رواداری شہرۂ آفاق ہو چکی تھی۔ شاہانِ اودھ جن کی حکومت کی بنیاد انسانیت پر تھی کی فرماں روائی میں ہندو و مسلم شیر و شکر ہو کر زندگی کے دن گذارتے تھے۔ اُن کے یہاں مذہبی جھگڑے اور فرقہ وارانہ فسادات کے لیے کوئی جگہ نہ تھی۔ اگر حکومت کے ایک شعبے کا حاکم اعلیٰ مسلمان تھا تو دوسرے شعبے کی باگ ڈور ایک ہندو حاکم کے ہاتھ میں تھی۔ یہی بے فکری اور فارغ البالی تھی جس نے اُردو ادب کو پایۂ معراج تک پہونچایا۔ اس دَور نے جتنے ہندو شعرا پیدا کیے دوسرا کوئی دور نہ کر سکا۔ لیکن برٹش حکومت کے آتے ہی مذہبی رواداری کوچ کر گئی۔

مذہب کے نام پر جھگڑے سر اُبھارنے لگے۔ انسانیت سوز حادثے رُو بہ پذیر ہونے لگے۔ "ہندو مسلم بھائی بھائی کا فلسفہ" اب صرف کتابوں کے اوراق میں تھا۔ خون کی ندیاں بہہ رہی تھیں۔ مکان نذرِ آتش ہو رہے تھے۔ آدمیت چیخ رہی تھی۔ تمدن سسکیاں لے رہا تھا۔ ایسے وحشت انگیز ماحول میں صفی لکھنوی اپنی شاعری کی سپر لے کر میدانِ عمل میں کود پڑے اور پکار کر کہا۔ ؎

لفظ "ہم" میں جس طرح "ہ" "م" ہیں شیر و شکر چاہیے ہندو مسلماں یونہی مل جل کر رہیں
قابلِ افسوس ہے وہ فرقہ وارانہ فساد مُلک میں جس سے لہو کی ندیاں ہر سو بہیں

یہ مذہبی جھگڑے اتنے راسخ ہو چکے تھے کہ اب ایک ہی مذہب کے دو گروہ آپس میں اُلجھے ہوئے نظر آنے لگے۔ ایک گروہ کے حامی دوسرے گروہ کے پیروکاروں کو صفحۂ ہستی سے مٹا دینے کی بات سوچنے لگے۔ لکھنؤ کا شیعہ۔ سنّی فساد اسلام کے چہرے پر ایسا بدنما دھبہ بن گیا جس کی سیاہی دن بدن بڑھتی گئی اور رواداری کا نُور مدھم پڑتا گیا۔ باہمی اتحاد جو کبھی جزوِ زندگی تھا اب طاقِ نسیاں ہو چکا تھا۔ چند ناعاقبت اندیش اور شرپسند عناصر کے ہاتھوں اسلامی شیرازہ بکھر رہا تھا۔ دونوں فرقے ایک دوسرے سے کوسوں دور ہوتے جا رہے تھے۔ لسان القوم صفی لکھنوی جیسا ناصح اور حسّاس شاعر جس کی شاعری کی بنیاد صلیت پر تھی ان انسانیت سوز واقعات کو دیکھ کر کیوں کر خاموش رہتا۔ اتحاد کو اپنی شاعری کا موضوع قرار دیا اور دونوں فریق کے حامیوں سے للکار کر کہا۔ ؎

وہ متواجِ قلزم وہ دریائے اعظم کہ دونوں کنارے ہیں جس کے دو عالم
زباں زد ہیں جس کے فتوحات پیہم ہے اسلام ہی بس کریں غور اگر ہم

تشیع تسنّن ہیں نہریں اسی کی
سمجھئے اسے آپ نہریں اسی کی

خدا ایک ہے جانتے ہیں یہ دونو رسول اپنا پہچانتے ہیں یہ دونو
جو کچھ کعبہ ہے مانتے ہیں یہ دونو اسے قبلہ گردانتے ہیں یہ دونو

عمل دونوں کا ہے کلامِ خدا پر
فدا دونوں ہیں عترتِ مصطفےٰ پر

اصولوں پہ جب متحد ہیں یقینی　　رہیں مل کے باہم سب اخوانِ دینی
عبث پھر فروعات پر نکتہ چینی　　مفضےٰ ما مضےٰ چاہیے بیشی بینی
چلیں گے یہ فرسودہ راہیں کہاں تک
پسِ پشت آخر نگاہیں کہاں تک

مولانا حالی کی طرح صفی لکھنوی کے دل پر بھی اسلام کی بربادی کا زخم کاری تھا۔ شیعہ سنی فساد نے اُن کے دل و جگر پر جو چوٹ پہونچائی تھی اُس کا صحیح اندازہ تو مرحوم ہی کو تھا لیکن ان بندوں میں ہم بھی اُن کی خلش کا احساس کر سکتے ہیں۔ ؎

فریقین شیر و شکر جس طرح تھے　　ابھی کچھ دنوں پیشتر جس طرح تھے
ہم آہنگ باہم دگر جس طرح تھے　　شب و روز کرتے بسر جس طرح تھے
اُسی طرح اب بھی رہیں مل کے باہم
وہ ماہِ صفر ہو کہ ماہِ محرم

ضرورت محبت کی ہے سخت ہم کو　　یہی تاج ہم کو یہی تخت ہم کو
یہ دولت جو چھوڑے گی یکلخت ہم کو　　کہے گی ہر اک قوم کم بخت ہم کو
صفی نام مٹ جائے گا دیکھ لینا
یہ اسلام مٹ جائے گا دیکھ لینا

یہ شاعر کا دل جہاں نما تھا جس میں عہدِ حاضر کی بدعنوانیاں اُبھر اُبھر کر سامنے آ رہی تھیں اور آنے والے زمانے کے لیے بھی تصویریں پیش خیمہ بنتی جا رہی تھیں۔ یہی وہ طرزِ شاعری ہے جو کسی ایک دور کے لیے مخصوص نہیں جس کی اہمیت ہر دور کے لیے یکساں ہے۔ اسی شاعری کے لیے بے خود

موہانی نے کہا ہے ؎

یوں کہہ رہا ہے کوئی دلِ مبتلا کا حال ہر اک سمجھ رہا ہے مری داستاں نہ ہو

صفی لکھنوی نے اپنے عہد کے شیعہ۔سنی فساد سے متاثر ہو کر یہ مسدس نظم کی تھی لیکن آج ہر مطالعہ کرنے والا اسے اپنے زمانے کی تاریخ سمجھتا ہے اور یہی صفی کی شاعری کا معجزہ ہے۔ اگر ان کی شاعری صرف بیسویں صدی کے پہلے نصف حصّے کی اصلیت میں مقید رہتی تو آج اس کی کبھی افادیت میں کمی آ جاتی اور اس عہد کا طالب علم اُس کا مطالعہ ضروری نہ قرار دیتا۔ یہی وجہ ہے کہ اُردو ادب کے ہزاروں شعراء جن کی شاعری کو اپنے عہد میں عام مقبولیت مل چکی تھی آج پردۂ خاموشی کا شکار ہو چکے ہیں کیونکہ اُن کی شاعری میں ایک مخصوص دور کی تصویر کشی کی گئی تھی۔ وہاں ہر دور کی رنگینی نہ تھی۔

لسان القوم صفی لکھنوی کی شاعری میں اپنے عہد کے تذکرے بھی ملیں گے اور ہر آنے والے زمانے کے ہمہ گیر جذبات بھی۔ اُن کی شاعری کی تصویر میں ہر رنگ نظر آئے گا اور یہی شاعر کی ہمہ رنگی ہے جو اُسے اُردو ادب کے دوسرے شعراء سے برگزیدہ کرتی ہے۔ جب بھی اُن کے اشعار پڑھے جائیں گے بلا تفریقِ زمانہ وجہِ سکون ہوں گے کیونکہ ایسی ہی شاعری کا انھوں نے ہمیشہ التزام کیا ہے۔ ؎

جب زباں پر آئے دلِ محظوظ ہو جائے صفی
ثمرۂ نخلِ قلم میں کچھ مزا ایسا تو ہو

سید زائر حسین کاظمی

۱۲ مارچ ۱۹۶۶ء

صفی و کامل

مخمس اول

اُٹھ ذرا بے فکر زیرِ گنبدِ اخضر نہ بیٹھ دُور جانا ہے لگا کر اس طرح بستر نہ بیٹھ
عالمِ غربت کو اے غافل سمجھ کر گھر نہ بیٹھ منزلِ ہستی کے ساکن مطمئن ہو کر نہ بیٹھ
یہ سرا ہے خانۂ آفات و وادِ انقلاب

ہم نے مانا تو ہے غوّاصی میں مشّاق اس قدر پہلے ہی غوطہ میں دامن بھر کے لاتا ہے گہر
دیکھ یہ سب کچھ سہی اندیشہ لازم ہے مگر کسبِ دنیا میں خطر ہے جان کا اے دیدہ ور
موج کے مُنہ پر نہ جا کورانہ مانندِ حباب

شوقِ تعمیرات ہو یا خواہشِ فرزند و زن ہے بنائے زندگی جب یہ وہی ہے بیخ کن
صُبحِ پیری آ گئی کر فکرِ کافور و کفن کیوں گھُلاتا ہے غمِ اولاد میں اپنا بدن
کیوں بناتا ہے زمیں پر قصرِ گردوں کا جواب

ناگزیر اک دن ہے جب اس دارِ فانی سے سفر جتنے عاقل ہیں وہ اس کو جانتے ہیں رہ گزر
پھر بتا کیوں محوِ لذّاتِ جہاں ہے اس قدر کیا لدوا للموت کی پہنچی نہیں تجھ کو خبر
کیا ابھی سمجھا نہیں مضمونِ وابنوا للخراب

قلعۂ روئیں حصارِ کوہ منظر ہے تو کیا چار دیواری اگر سدِّ سکندر ہے تو کیا
رو کشِ بامِ بلندِ قصرِ قیصر ہے تو کیا طاقِ کسریٰ سے عمارت مرتفع تر ہے تو کیا
جبکہ ہو سکتا نہیں پیکِ اجل کا سدِّ باب

چرخ نے نقشہ بگاڑا ہائے کس کس شہر کا سبزہ رویوں کو پلایا ہے پیالہ زہر کا
حال ابھی آئینہ ہو جائے گا اُس کے قہر کا چشمِ عبرت سے تماشہ دیکھ باغِ دہر کا
کیا گل اندامُوں کو روتی ہے چمن میں جوئے آب

انقلابِ دہر اسے کہتے ہیں دیکھ اے ہم نشیں ۔ کل جو بالائے زمیں تھے آج ہیں زیرِ زمیں
کیوں تہ و بالا نہ ہو سینہ میں یہ قلبِ حزیں ۔ آہ ساکن ہیں خرابے میں لحد کے وہ حسیں
صفحۂ ہستی پہ جو تھے نقطہ ہائے انتخاب

نازنینانِ سہی قد سرو بالا مہ جبیں ۔ انجمن افروزِ گیتی عالم آرا مہ جبیں
انجمِ افلاکِ خوبی زہرہ سیما مہ جبیں ۔ قبر کے گوشہ میں ہیں درماندہ کیا کیا مہ جبیں
خاک کے پردے میں ہیں پوشیدہ کیا کیا آفتاب

دہشتِ بیدادِ گردوں کے یہی آثار ہیں ۔ لالہ و گل گوشہ گیرِ دامنِ کہسار ہیں
سختیاں کیونکر نہ جھیلیں کیا کریں ناچار ہیں ۔ مدفنوں میں زیرِ سنگ و خشت وہ رخسار ہیں
بار تھی جن تازہ رس پھولوں کو شبنم کی نقاب

نازکی سے اس کم آتا تھا جن کو عطرِ گل ۔ بار تھا ہر چند کیسا ہی سبک ہو عطرِ گل
ہوتے تھے چیں بر جبیں ان کو اگر دو عطرِ گل ۔ دردِ سر کے خوف سے ملتے نہ تھے جو عطرِ گل
آہ ان نازک مزاجوں کی ہے یوں مٹی خراب

باندھ چلنے پر کمر بجنے کو ہے کوسِ اجل ۔ آنسوؤں سے ہاتھ منہ دھو ڈال اور آنکھوں کو مل
اٹھ نمازِ صبح پڑھ حی علیٰ خیر العمل ۔ شام سے سوتا ہے کب تک سوئے گا کروٹ بدل
رات تھوڑی رہ گئی بیدار ہو اے مستِ خواب

کیا ہوا غفلت سے دیکھ آخر مآلِ قومِ لوط ۔ چھوڑ لہو و لعب ادا کر حق پرستی کے شروط
اخترِ بیتِ شرف ہے مائلِ برجِ ہبوط ۔ صبحِ پیری لا چکی کافور تک بہرِ حنوط
کوئی دم کا میہماں ہے بے خبر تیرا شباب

کوچ جب لازم ہے تو پھر کیا مقالِ قال و قیل ۔ کوئی زادِ آخرت کی اپنے پیدا کر سبیل
اب اقامت کا زمانہ ہے نہایت ہی قلیل ۔ کوسِ رحلت کر چکا فریاد حیّوا الرّحیل
دے چکا طبلِ سفر آواز قوموا للذہاب

بہرِ طولِ عمر ہر دم مانگتا ہے کیوں دعا ۔۔۔ کیوں ہے او ناعاقبت بیں تشنۂ آبِ بقا
تا قیامت بھی جو مثلِ خضر تو زندہ رہا ۔۔۔ زندگی جب بیوفا ہے انس پھر جینے سے کیا
موت جب لابد ہے پھر مرنے سے کیسا اجتناب

دیکھ لے سرمہ لگا کر دل کی چشمِ کور میں ۔۔۔ نقشۂ مہر سلیمانی نقش پائے مور میں
یاد رکھیں خوب جو تنتے ہیں اپنے زور میں ۔۔۔ جائیں گے شاہ و گدا دونوں دہانِ گور میں
سوئے گا کنجِ لحد میں شیخ ہو اس میں کہ شاب

بہرہ ور ہے کون عیشِ بے خلل سے خلق میں ۔۔۔ ہے مفر کب چرخ کے جنگ و جدل سے خلق میں
کوئی دل رہتا نہیں اک دن بھی کل سے خلق میں ۔۔۔ ایک کو راحت نہیں ترسِ اجل سے خلق میں
کو دسکتے میں ہیں برگِ کاہ کو ہے اضطراب

اہلِ عالم سب مسافر ہیں عدم کی راہ کے ۔۔۔ ہے فنا لازم ہر اک شئے کو سوا اللہ کے
دل نہ لرزیں کس طرح مردانِ حق آگاہ کے ۔۔۔ شعلۂ غم سے اسی اندیشۂ جانکاہ کے
مرغ بالائے ہوا دریا میں ہے ماہی کباب

زلزلے میں رعشۂ پیری کے ہونے دے سکوں ۔۔۔ دیکھنا پھر قصرِ تن کا حال ہے کیسا زبوں
منہدم ہو جائیں گے قائم ہیں اب جو جو ستوں ۔۔۔ خاک پر خیمہ گرے گا زندگی کا سرنگوں
قطع رشتے اک دن ہو جائیں گے مثلِ طناب

دل فریبی پر ذرا اس زالِ دنیا کی نہ جا ۔۔۔ خونِ ناحق مثلِ سودا یہ رکھتی ہے روا
اس کے دھوکے میں نہ تو مانندِ کیکاؤس آ ۔۔۔ چرخ کر دے گا سیاوش کی طرح تجھ کو فنا
لاکھ تو قوت میں ہو ہم پنجۂ افراسیاب

بھر نہ آزادی کا اپنے دم کہ ہونا ہے اسیر ۔۔۔ ہیچ ہے جاہ و تجمل اور یہ تاج و سریر
خواہ اپنے وقت کا تو بادشہ ہو یا وزیر ۔۔۔ ملکِ غربت کی طرف جانا ہے تجھ کو ناگزیر
خانۂ وحشت میں رہنا ہے تجھے بے ارتیاب

رہ چکا اک عمر سرگرمِ شکارِ وحش و طیر　　پھر چکا گردِ حریمِ کعبہ و اطرافِ دیر
جی بہلتا ہی نہیں صحنِ گلستاں کے بغیر　　جمع کر زادِ سفر بس ہو چکی دُنیا کی سیر
کر چکا ٹھنڈی ہوا کا اس چمن میں اکتساب

تا کجا آشوبِ گیر و دارِ افواجِ خطا　　کر و فر ہنگامۂ پیکارِ افواجِ خطا
اب رہے گا تا کجے سردارِ افواجِ خطا　　رہ چکا برسوں سپہ سالارِ افواجِ خطا
کر چکا تاراج خاطر خواہ اقلیمِ ثواب

مدتوں کرتا رہا برباد زر مانندِ گُل　　عمر بھر کھایا کیا خونِ جگر مانندِ گُل
آنسوؤں سے کر چکا دامن کو تر مانندِ گُل　　اب گریباں پیرہن کو چاک کر مانندِ گُل
کھا چکا دنیا کے غم میں مثلِ سُنبل پیچ و تاب

خون کا پیاسا ہے گرگِ نفسِ بدکینہ تو دیکھ　　خوف سے کیا حال ہے دل کا ترے سینہ تو دیکھ
کھول کر آنکھیں ذرا تقویمِ پارینہ تو دیکھ　　اُٹھ گئے پردے سیہ کاری کے آئینہ تو دیکھ
جا بجا سے کھل گیا ریشِ حنائی کا خضاب

تا کجا ایں استماعِ نغمہائے پُر اثر　　تا کجا ایں انتخابِ نقلِ مے از خشک و تر
تا کجے آخر نشستن با بتانِ عشوہ گر　　رہروِ ملکِ عدم نزدیک ہے وقتِ سفر
توبہ کن وز توبہ اکنوں سر مپیچ در و تاب

شمعِ حسنِ خلق کو تو انجمن افروز کر　　سائلوں کو باریابی سے شرف اندوز کر
کوششِ صیدِ ہمائے طالعِ فیروز کر　　دست و دل بخشش کا دونوں کو ادب آموز کر
کلک و لب دونوں کو دے فرمانِ تحصیلِ ثواب

دے انہیں جو زر کے طالب ہوں تری سرکار سے　　اور اُن کو بھی طلب کرتے نہیں جو عار سے
اے سخاوت پیشہ ابرِ دستِ گوہر بار سے　　جھولیاں بھر دے فقیروں کی درم و دینار سے
پھیر ناکاموں کو لا کر اپنے در سے کامیاب

کر سلوک اے دوست احباب پریشاں حال سے — زادِ عقبیٰ جمع کر لے مزرعِ اعمال سے
ہے اگر اندیشہ تجھ کو پرسشِ اعمال سے — جھاڑ کر دامن کو اٹھ گردِ متاعِ و مال سے
پاک دنیا ہی میں کر دے مالِ دنیا کا حساب

ہو چکی تخمیسِ نظمِ کاملِ روشن گہر — فارسی شعروں کی اب تضمین ہے مدِ نظر
جا صفیؔ کے ساتھ گورستاں کی سمت اے دیدہ ور — چشمِ عبرت برکشا دُ مالِ شاہاں را نگر
تا چسان از گردشِ گردونِ گرداں شد خراب

کرد گارِ لم یزل سلطان حیٌّ لایموت — کامدہ یونسؑ بحکمِ او برون از بطنِ حوت
سطوتش زد بر لبِ نام آوراں مہرِ سکوت — پردہ داری میکند بر طاقِ کسریٰ عنکبوت
چغد نوبت می زند بر گنبدِ افراسیاب

مخمسِ ثانی

تم تو ہمدردِ صفیؔ ہو کیا نہیں تم کو خبر — غمزدوں کے ہجر میں کس طرح ہوتی ہے بسر
شمع بالیں پر جلانے خاک برسر نوحہ گر — شب کو جا نکلا تھا میں کاملؔ مزارِ دوست پر
اس جہت سے مثلِ ابر آنکھیں مری خونبار ہیں

کیا بتاؤں اس دلِ نازک پہ کیا صدمہ سہا — پہلے آنسو بعد اس کے خون آنکھوں سے بہا
دیر تک جب جوشِ رقت کا یہی عالم رہا — قبر پر الحمد پڑھ کر دوست سے میں نے کہا
ہم گریباں چاک ماتم میں ترے اے یار ہیں

جس جگہ خود ہے بُلا لے جلد ہم کو بھی وہیں — جاں کہیں ہے تن کہیں ہے تو کہیں ہے ہم کہیں
آنکھ سے دم بھر جدا ہوتی نہیں اب آستیں — روز و شب رہتے ہیں تیری یاد میں اے مہ جبیں
داغِ فرقت سے جگر میں زخم دامن دار ہیں

ڈھونڈھتی ہیں تجھ کو آنکھیں جا بجا شام و سحر   یادِ دل میں ذکر ہے لب پر ترا شام و سحر
کیا بتائیں شغل اب رہتا ہے کیا شام و سحر   اشک باری مشغلہ ہے آنکھ کا شام و سحر
شاہد اس دعوے کے رُخ پر آنسوؤں کے تار ہیں

دیکھ لیں اک بار تجھ کو اور ہم مر جائیں بس   اب کسی شے کی نہیں اس کے سوا دل میں ہوس
تیرے دامن تک نہیں جیسے کہ ہم کو دسترس   خار کے مانند سینے میں کھٹکتے ہیں نفس
مرگ کے طالب ہیں اپنے زیست سے بیزار ہیں

دل تری فرقت میں ہے جیسے گرفتارِ محن   تیرہ و تار اک جہاں ہے مثلِ زندانِ کہن
بے ترے عشرت کدہ اپنا تو ہے بیت الحزن   شاد ہے کچھ تو بھی زیرِ خاک اے نازک بدن
شمع روشن ہے گلوں کے قبر پر انبار ہیں

یا ہماری ہی طرح گر ہے اسیرِ بندِ غم   تو ہی کہہ دے کہ ہے کس بات کا آخر الم
حال کچھ منھ سے ترے سن لیں کہ ہیں مشتاق ہم   کیا ہوا مرنے کے بعد اے راہیِ ملکِ عدم
لوگ کیسے ہیں وہاں کے اور کیا اطوار ہیں

کوئی صحرا ہے ہوائیں سرد چلتی ہیں کہ گرم   کوئی دریا ہے ہوائیں سرد چلتی ہیں کہ گرم
موسم اچھا ہے ہوائیں سرد چلتی ہیں کہ گرم   ملک کیسا ہے ہوائیں سرد چلتی ہیں کہ گرم
نہریں جاری ہیں چمن میں باغ میں اشجار ہیں

راستے بھر میں کہیں ہے یا کوئی بیشہ نہیں   جھاڑیاں گنجان ہیں یا قابلِ تیشہ نہیں
رہزنی غارت گری کا تو وہاں پیشہ نہیں   قافلے چلتے ہیں لٹنے کا تو اندیشہ نہیں
گرد کم اڑتی ہے راہیں صاف ہیں ہموار ہیں

کیا طریقے واں کے کیا دستور ہیں کیا حال ہے   لوگ خود مختار یا مجبور ہیں کیا حال ہے
ہم سفر خوش خلق ہیں معذور ہیں کیا حال ہے   منزلیں نزدیک ہیں یا دور ہیں کیا حال ہے
راہ میں کچھ بستیاں ہیں شہر ہیں بازار ہیں

نا موافق یا موافق ہے ترے آب و ہوا　　تو فرو کش ہے جہاں کیا اُس جگہ کا ہے پتا
ہے بتا کس نام سے مشہور وہ مہماں سرا　　جس محل میں جا کے تو اُترا ہے اے رنگیں ادا

کس طرح کا قصر ہے کیسے در و دیوار ہیں

ہے عمارت کچھ وہ رنگیں بھی کہ سرتاپا سفید　　مختلف ہیں رنگ کمروں کے کہ ہر کمرا سفید
ہیں سیہ یا پردہ ہائے اطلس و دیبا سفید　　چھت منقش ہے کہ سادے فرش رنگیں یا سفید

تخت کیسے ہیں منبت یا مرصع کار ہیں

ہے وہ خشتی یا کہ سنگیں خانۂ محکم اساس　　صاف میداں دور تک ہے یا چمن ہے آس پاس
شیشہ آلات اس میں ہیں کس رنگ کے اے حق شناس　　سبز جلتے ہیں کنول یا سُرخ روشن ہیں گلاس

باغ ہے سبزہ ہے کچھ اشجار ہیں اثمار ہیں

ساز و ساماں کیا ہیں تفریحِ دلِ ناساز کے　　چہچہے رہتے ہیں کیا مرغانِ خوش آواز کے
دامنِ گل پر کھنچے ہیں نقش کس پرداز کے　　پھول ہیں کس رنگ کے پتے ہیں کس انداز کے

مرغ زریں بال ہیں یا عنبریں منقار ہیں

رہنے والے جس قدر ہیں اُن میں ہیں کتنے فریق　　کون کس کا ہے مخالف کون ہے کس کا رفیق
چھوڑ کر ہم کو جہاں پہونچے ہیں یارانِ رفیق　　اہل صحبت کون ہیں کیا گفتگو کا ہے طریق

خوش بیاں خوش وضع یا کج فہم بد گفتار ہیں

سب پرانے ہیں مکانات اس جگہ یا کچھ نئے　　کون کون اشخاص اُس بستی میں ہیں آ کر بسے
بعض نو وارد ہیں یا کُل رہتے ہیں اک عمر سے　　لوگ ہمسائے میں ہیں کس قسم کے کس وضع کے

کچھ مروت آنکھ میں ہے خلق کے آثار ہیں

یہ بھی ممکن ہے کہیں واں سے چلا جائے کبھی　　یا جسے چاہے وہیں پاس اپنے بلوائے کبھی
دل بہلنے کا ہے کیا ساماں جو گھبرائے کبھی　　کچھ حسینانِ پری وش بھی نظر آئے کبھی

اُن کے قد کیسے ہیں کیسے گیسوئے خمدار ہیں

کیوں نگاہِ ناز سے چھلنی بھی آتا ہے انھیں　　خوش ادا ایسے ہیں جن پر اہلِ عالم جان دیں
ناک، نقشہ رنگ کیسا ہے بیاں کر کچھ سُنیں　　شکلیں گوری گوری ہیں یا سانولی ہیں صورتیں
ابروئے کج کعبہ کی محراب یا تلوار ہیں

سانٹھ گانٹھ اسلام سے یا کفر سے ہے ساز باز　　دم کشِ ناقوس یا پابند آدابِ نماز
چشم بُت خانہ کہ ابرو مسجدِ اہلِ نیاز　　لکھنؤ کی ہیں ادائیں یا بنارس کے ہیں ناز
ہیکلیں سینوں پہ یا طوقِ کمر زنار ہیں

فائدے تو نے کسی کی ذات سے پائے کبھی　　کچھ تحائف دوستانہ تجھ کو بھجوائے کبھی
خدمتِ مہماں نوازی کیوں بجا لائے کبھی　　دعوتیں بھیجیں فقط یا آپ بھی آئے کبھی
اپنے اپنے شغل میں رہتے ہیں یا بیکار ہیں

نطق پر قادر ہیں یا قدرت نہیں گفتار کی　　کچھ نہیں کھلتا زباں کیوں بند آخر ہو گئی
ہے سکوت اُن کا بتا دے عارضی یا دائمی　　بات کرنے کی صدا اصلا نہیں آتی کبھی
کس طرح کے لوگ ہیں سوتے ہیں یا بیدار ہیں

تو جہاں رہ شاد اے یارِ محبت کوش رہ　　شاہدِ مقصود سے پیوستہ ہم آغوش رہ
روز و شب مسند طرازِ بزمِ ناے و نوش رہ　　قبر سے آئی صدا اے دوست بس خاموش رہ
ہم اکیلے ہیں نہ یاں احباب نے اغیار ہیں

سرگزشت اپنی سنائیں کیا تجھے اے مہرباں　　زندگی سے بڑھ کے مرنے پر اٹھائیں سختیاں
فصلِ گُل کیسی ارے کیسا ہجومِ بلبلاں　　باغ کیسا پھول کیسے عقل تیری ہے کہاں
کنجِ تنہائی ہے اور افعی گلے کے ہار ہیں

حال کیا ہے پوچھنا اُس کا جو ہو آفت نصیب　　کیا کہوں کس کشمکش میں مبتلا ہوں میں غریب
دور ہو کیوں کر ہراس اس دل سے جب آئے قریب　　دو فرشتے آتے ہیں مدفن میں با شکلِ مہیب
کس طرح ہاتھوں میں ان کے گرزِ آتش بار ہے

خاک ہو جل کر جسے آنکھیں دکھائیں قہر کی ہر نگاہِ کرم سے بجلی گرائیں قہر کی
رعد کے مانند آوازیں سنائیں قہر کی شق ہو انساں کا کلیجہ وہ صدائیں قہر کی
چوڑے چوڑے سینہ و پہلو ہیں یا کہسار ہیں

کر رہے ہیں کچھ سوالاتِ مقرر قبر میں دوں جواب ان کو مگر ہے عقل ششدر قبر میں
کیا کہیں تجھ سے گزرتی کیا ہے دل پر قبر میں جبر سے ہم کو بٹھایا ہے اٹھا کر قبر میں
رعب سے اِن کے ہمارے دست و پا بیکار ہیں

تو ہے از راہِ کرم پرسانِ حال اے مہرباں آہ اپنے دل کی حالت کر نہیں سکتے بیاں
کیا کریں ہیں عاجز و مجبور بے تاب و تواں کھولتے ہیں لاکھ کھُل سکتی نہیں لیکن زباں
جسم میں رعشہ ہے تیرِ غم جگر کے پار ہیں

بے نشانوں سے نہ مستفسر ہو کچھ اے نام جو کیا کہیں تجھ سے کہ حالت ہے یہاں کی گو مگو
آپ ہی اندازہ کر لے دیکھ کر اس جبر کو وہ ہمارا پیکرِ نازک جو تجھ کو یاد ہو
آج خاکِ قبر سے اس پر منوں کے بار ہیں

مختصر اک ماجرائے غم ہے جو تو نے سُنا ورنہ طولانی بہت ہیں واقعاتِ جاں گزا
پر نہیں ممکن بیاں اِن کا کہ ہیں رازِ خدا لے زیادہ بات کر سکتے نہیں اب گھر کو جا
دل میں آزردہ نہ ہونا کیا کریں ناچار ہیں

سحر یا اعجاز اے یارانِ فن ہے یہ کلام دیر ہے یا کعبۂ اہلِ سخن ہے یہ کلام
غم کدہ یا عشرتوں کی انجمن ہے یہ کلام حُجلۂ شادی ہے یا بیت الحزن ہے یہ کلام
مرثیہ ہے یا غزل ناوک ہیں یا اشعار ہیں

مخمسِ ثالث

ہے خلیلِ کعبۂ دل تو ہے اے عالی مقام تیرے ہی دم سے ہے ارکانِ حقیقت کا قیام
داخلِ حسنِ عبادت ہے ترا ذکرِ مدام نام کا تیرے وظیفہ ہے زباں کو صبح و شام
مرحبا اے دردِ الفت عشق ہے ترا ہی نام

دے غمِ ہجراں مگر مدِّ نظر تخفیف رکھ بارِ احساں مجھ پہ اے شایانِ توصیف رکھ
کیا قباحت ہے روا دم بھر ذرا تکلیف رکھ غم کدے میں خاطرِ ناشاد کے تشریف رکھ
منزلِ دل کو مشرّف کر بہ اعزازِ تمام

گوشۂ زنداں میں اے دل تیرے یوسف ہے مکیں ہے سیہ خانہ تیرا چشمِ سیاہِ حورِ عین
کیوں نہ ہو وسعت میں تو ہم رنگِ فردوس بریں بارک اللہ بارک اللہ اے دلِ اندوہ گیں
تیرے ویرانے میں ایسا میہماں عالی مقام

ہاں مگر تو مرتبے سے عشق کے واقف نہیں اس قدر تو مرتبے سے عشق کے واقف نہیں
حسن اگر تو مرتبے سے عشق کے واقف نہیں بے خبر تو مرتبے سے عشق کے واقف نہیں
عشق ہے فرماں روائے کشورِ نور و ظلام

عشق ہے اصلی حرارت عشق ہے روحِ رواں عشق سے ہے گرمیِ بازارِ حسنِ گل رخاں
عشق کے دم سے فروغِ شعلۂ شمعِ زباں عشق سے عالم میں زینت بخش ہے بزمِ جسم و جاں
عشق سے دنیا میں روشن ہے چراغِ ننگ و نام

عشق سے بہتر نہیں کون و مکاں میں کوئی چیز لیکن اس کے واسطے درکار ہے چشمِ تمیز
بندگانِ بارگاہِ عشق ہیں ہر دل عزیز عشق وہ سرکار ہے جس کی زلیخا ہے کنیز
عشق وہ بازار ہے جس میں ہے یوسف سا غلام

عشق ہے دستورِ اعظم حسنِ شاہِ خود پرست — زیردستوں میں سے اک اس کی ہے عقلِ چیرہ دست
تھا یہ مضمون یاد ہو تجھ کو جو فرمانِ الست — عشق ہے صبحِ ازل کا حکمرانِ بند و بست
عشق ہے شامِ ابد کا رمز دانِ انتظام

عشق کا خوانِ کرم ہے رو کشِ خوانِ خلیل — ہیں نمک پروردگانِ عشقِ شاہانِ جلیل
بحر و بر میں کس جگہ پر یہ نہیں تابعِ دخیل — عشق کے دریا کا اک قطرہ ہے نہرِ سلسبیل
عشق کے صحرا کا اک گوشہ ہے گلزارِ دوام

خاک و باد و آب و آتش سے تخالف کا فتور — دفع کرنے میں یہی ہے جو نہیں کرتا قصور
عشق ہی کا چار سو جلوہ ہے نزدیک و دور — عشق ہی وہ نور ہے اضداد میں جس کا ظہور
عشق ہے وہ ربط جس سے ہے عناصر کا قوام

دودِ شمعِ عشق ہے عطرِ دماغِ ہوشیار — گردِ راہِ عشق گیا ہے مرہمِ پائے فگار
عشق ہے صبر آزمائے عاشقانِ بے قرار — باغ میں ہے بوئے گل اور دشمن میں تیغِ نوکِ خار
سنگ کے دل میں شرر دریا میں ہے ماہی کا دام

صورتِ غربال سینہ اس سے چھنتا ہے کبھی — گاہ اپنا دشمنوں کا دوست بنتا ہے کبھی
جھک کے ملتا ہے کبھی یہ اور تنتا ہے کبھی — شعلۂ سرکش کا پیراہن پہنتا ہے کبھی
پیکرِ انجمِ حسن میں گاہ کرتا ہے قیام

ہے کہیں پر درسِ خوانِ مکتبِ عجز و نیاز — ہے کسی جا یکہ تازِ عرصہ گاہِ کبر و ناز
ہے غرض ہر رنگ میں شاطر یہ عشقِ حیلہ ساز — سرنگوں خلوت میں ہے اور انجمن میں سرفراز
مدرسے میں ہے کتاب اور معرکے میں ہے حسام

عشق ہی ہے عشق ہی ہے باعثِ افشائے راز — عشق ہی ہے عاشق و معشوق سے رکھے جو ساز
عشق ہی ہے جو سکھائے شیوۂ سوز و گداز — شمع کے جامے میں کرتا ہے کبھی شعلے کا ناز
گاہ پروانے کی صورت جل کے ہوتا ہے تمام

جنبشِ ابرو کی اس کے پاس ہے شمشیرِ تیز
سنبلِ گیسو کی رکھتا ہے کمندِ مشک بیز
طالب و مطلوب دونوں سے نہیں اس کو گریز
شکلِ بلبل کے کبھی کرتا ہے نالہ دردِ خیز
پیرہن میں گل کے ملتا ہے کبھی عطرِ مشام

عشقِ صادق ہے پیمبر، حسن اگر معبود ہے
عشق ہی ساجد ہے اس کا حسن اگر مسجود ہے
خلوت و جلوت جہاں دیکھو وہاں موجود ہے
پردۂ محمل میں لیلیٰ سے یہی مقصود ہے
خاکِ مجنوں ہے اسی کا نجد کے وادی میں نام

عشق میرا چارہ گر ہے عشق میرا کارساز
مثلِ خضر اس کی دعا سے پائی ہے عمرِ دراز
عشق کا دامن مجھے ہے تکیہ گاہِ عشق و ناز
عہدِ طفلی سے ہے مجھ کو اس کی خدمت میں نیاز
جس زمانے میں کہ مہد تھا میرا مقام

عشق سے حسنِ ارادت مجھ کو تھا حد سے سوا
مجھ پہ بھی لطف و کرم تھا عشق کا بے انتہا
پر فراقِ عشق کچھ دن تھا جو منظورِ خدا
اتفاقاً میں ہوا ایسے الم میں مبتلا
جن سے رنج و فکر میں رہنے لگا ہر صبح و شام

شدتِ افسردگی سے تھا جو بے حس دل مرا
یہ نہیں معلوم کب نقشِ محبت مٹ گیا
کچھ تو کی میں نے بھی نادانستہ تقصیرِ وفا
عشق بھی کچھ خود بخود برخاستہ خاطر ہوا
میں تو اپنی فکر میں تھا بیشتر سے تلخ کام

عشق کی بدلی ہوئی دیکھی جو کچھ میں نے نگاہ
حال اس غم سے ہوا میرا زیادہ تر تباہ
دل نہ ہو جب صاف مشکل ہے محبت کا نباہ
دفعتاً بالکل ہوئی مسدود بابِ رسم و راہ
مدتوں تک کنجِ عزلت میں رہا میرا قیام

ساغرِ مہر و محبت پھر پیا ہے عشق نے
خردۂ جاں بخشِ وصلت بھر دیا ہے عشق نے
میرے آسائش کا ذمہ پھر لیا ہے عشق نے
بعدِ مدت پھر قدم رنجہ کیا ہے عشق نے
یعنی پھر مدِ نظر ہے اک حسینِ لالہ فام

وہ حسیں یوسف ہو جس کے سامنے غیرت سے سُست   شوخ و شنگ ایسا کہ سن کر ذکر بول چابق و چُست
زلف ہے شامِ ابد جس کی جبیں صبحِ نخست   نجم کی تشبیہ جس کے خال سے ہے نادرست
بدر کی تمثیل ہے چہرے سے جس کے ناتمام

وہ گزرتی ہے دلِ مشتاق روئے خوب پر   ہجرِ یوسف میں جو گزری حضرتِ یعقوب پر
خونِ دل سے یہ رقم ہے صفحۂ مکتوب پر   وائے قسمت دل جو آیا بھی تو کس محبوب پر
جس کی منزل سے دعا پھرتی ہے بے نیلِ مرام

خامہ فرسائی تو کی لیکن پھر اس سے مدعا   نامہ بر کو جب نہیں معلوم اُس گل کا پتا
کیا نکالوں راہ عاجز ہے مرا ذہنِ رسا   اے نسیمِ صبح کوئی مشورہ تو ہی بتا
سخت حیرت ہے کہاں بھیجوں خطِ شوق و پیام

کیا کروں تدبیر جس سے دفع ہو دل کا ملال   کس طرح معلوم ہو اُس بے خبر کو میرا حال
خط کوئی پہنچائے اُس تک خام ہے بالکل خیال   نامہ و پیغام کا جانا تو ہے امرِ محال
ہاں مگر تجھ سا پیمبر ہو کوئی بالا خرام

اور وہ چاہے تو ممکن ہے وہاں اُس کا گزر   ورنہ کیا طاقت پرندہ تک کوئی مارے جو پَر
کون اِس قابل ہے پھر جس کو بتاؤں نامہ بر   خیر تو ہی ایک دن وقتِ سحر تکلیف کر
جس جگہ سوتا ہے وہ رشکِ قمر بالائے بام

ہے وہ خلوت گاہِ مہر و ماہ کا بیت الشرف   نور سایہ کی جگہ پھیلا ہوا ہے ہر طرف
ہوں گے پہرے پر معیّن خادمانِ سر بکف   حاجبانِ عشق ہوں گے دست بستہ صف بصف
دور باشِ حُسن کا ہوگا نہایت اہتمام

سیج پر پھولوں کے اک جانب بصد جاہ و حشم   مستِ خوابِ ناز ہوگا وہ پری رو صبح دم
ہے تجھے پھر اختیار اتنا کہے دیتے ہیں ہم   بے محابا یوں نہ رکھنا قصرِ جاناں میں قدم
بوئے گل کی راہ سے آہستہ بڑھنا چند گام

قصرِ عرش آثار کے پہلو میں رہنا منتظر　　پھر درِ دلدار کے پہلو میں رہنا منتظر
سایۂ وحشی دیوار کے پہلو میں رہنا منتظر　　خواب گاہِ یار کے پہلو میں رہنا منتظر

دست بستہ پھر یہ کہنا بعد تمہیدِ سلام

اے گلِ باغِ نزاکت اے چمن پیرائے حسن　　اے مہ برجِ سعادت اے دُرِ دریائے حسن
قد یہ ہے تیرے ہی موزوں خلعتِ زیبائے حسن　　اے فروغِ ملکِ خوبی اے جہاں آرائے حسن

تاج و تختِ ناز کی رونق رہے تجھ سے مدام

ہیں پڑے چاروں طرف ڈالے ہوئے ڈیرے بہت　　کرتے ہیں کوچے میں تیرے رات دن پھیرے بہت
در فقیروں کی طرح رہتے ہیں یوں گھیرے بہت　　بندگانِ بارگاہِ عشق ہیں تیرے بہت

لیکن اک درویش ہے سب سے زیادہ تلخ کام

کچھ نہیں آب و غذا جس کے بجز خونِ جگر　　سینے میں اک آگ سی ہے مشتعل آٹھوں پہر
پھنک رہا ہے سوزِ غم سے اُف نہیں کرتا مگر　　واقعی ایسا بھی کم ہوگا کوئی شوریدہ سر

عاشقِ صادق ہے پروانے کی صورت لا کلام

وہ مریضِ ہجر وہ دلدادۂ روئے حبیب　　درد جس کا لا دوا ہے مرگ جس کی ہے طبیب
بیکس و مجبور، آوارہ وطن، غربت نصیب　　ایک مدت سے عجب عالم میں رہتا ہے غریب

نالہ و فریاد واجب، خواب و خور مطلق حرام

یوں بسر کرتا ہے اپنی زندگی وہ نامراد　　جس طرح مظلوم کوئی جس کی دی جائے نہ داد
درد اُٹھتا ہے جگر میں دل میں جب حد سے زیاد　　بیٹھ جاتا ہے کسی صحرا میں مثلِ گردِ باد

مرغِ بسمل کی طرح چلتا ہے گاہے چند گام

چل کے گر پڑتا ہے آنسو کی طرح جب ایک بار　　پھر اٹھائے سے بھی اٹھ سکتا نہیں وہ زینہار
اشک جاری چشمِ تر سے صورتِ ابرِ بہار　　لب پہ نالہ نالہ کیسا جیسے برقِ شعلہ بار

مشتعل انبارِ خس کی شکل اعصاب و عظام

آسماں جس کی ہلاکت کا ارادہ ہو کیے
چاہتی ہو یہ زمیں خون اس کا جیتے جی پیے
بےسروساماں ہو جس کا وہ کہو کیونکر جیے
ہیں بہیا دشت میں بیکس کی راحت کے لیے
ریگِ تفتیدہ کے بستر گردِ صحرا کے قیام

ہو جو تیرا عاشقِ شوریدہ سر اے ماہ رو
ہو جو تیرا زخمی تیغ نظر اے ماہ رو
موردِ بیداد ہو وہ اس قدر اے ماہ رو
اپنے دل میں آپ تو انصاف کر اے ماہ رو
عاشقوں پر ہے جفا ہر ایک ملت میں حرام

کب تلک منھ پر نہ آئے شکوۂ جور و جفا
امتحاں دیتا ہے کب تک دل صبر آزما
طول ہجراں کی بھی ہے کچھ آخر کار انتہا
دردِ فرقت تا کجا امیدِ وصلت تا کجا
کچھ نفس باقی ہیں وہ ہو جائیں گے اک دن تمام

او تغافل کیش ہو جائے نہ خونِ بےگناہ
تو ہو واقف یا نہ ہو اللہ اس کا ہے گواہ
ہم بھی اس سرکار کے مثل صفی ہیں خیرخواہ
خیر اس قصے سے کیا مطلب ہیں اے رشکِ ماہ
کامل غم دیدہ نے تجھ کو دیا ہے یہ پیام

ذرۂ ناچیز ہوں تیری تجلی گاہ میں
چشم و لب سرگرم ہیں ہر وقت اشک و آہ میں
ناتوانی سے نہیں کچھ فرق مجھ میں کاہ میں
جان کا خرمن لیے بیٹھا ہوں تیری راہ میں
مہربانی سے چمک اے برقِ تاباں والسلام

نوٹ:۔ "مولوی علی میاں کامل شاعری میں میر انیس سے ٹکر لینے کا دعویٰ کرتے تھے" ان کے زمانہ میں مرثیہ گوئی عروج پر تھی اس لیے کامل نے بھی بہت سے مراثی کہے۔ سلام، رباعیاں اور قطعے بھی نظم کیے۔ ان کے تین قطعات پر جو اپنے عہد میں بہت مقبول ہو چکے تھے صفی لکھنوی نے یہ مخمس نظم کی تھی جو حسب فرمائش مولوی ظفر حسن المعروف بہ حسن عسکری خلفِ اکبر جناب مصنف موصوف سید محمد عرف چھدن صاحب نے تصویر عالم پریس ڈیوڑھی آغا میر لکھنؤ سے پمفلٹ کی شکل میں شائع

کی تھی اور جس کی قیمت ۲ر فی نظم رکھی گئی تھی۔ مولوی علی میاں کامل سے صفی لکھنوی کا قریبی رشتہ تھا۔ صفی کی اہلیہ محترمہ جناب کامل کی ہمشیرہ تھیں۔ صفی لکھنوی نے اس نظم میں بے ثباتی دنیا پر ایک لمبی تقریر کی ہے اور انسان کو اس کی خرابیوں سے آگاہ کیا ہے۔ عالم فانی کے نقائص اور جاودانی کے اوصاف بیان کیے ہیں۔ مکمل نظم اخلاقیات کا ایک مجسمہ ہے۔ اور اُردو شاعری کا ایک گراں بہا سرمایہ جس کے متعلق پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب مرحوم نے کہا تھا کہ مولانا صفی نے اگر صرف یہی مخمس نظم کیا ہوتا تو بھی مولانا اُردو شاعری کے اُن چند شاعروں کی فہرست میں جگہ پاتے جو اُردو شاعری کے لیے باعثِ فخر ہیں۔

———— سید زائر حسین کاظمی

(تند اب)

ساقی نامہ

کہاں ہے تو اے ساقیٔ شوخ و شنگ
کہ سردی نے اپنا جمایا ہے رنگ

ذرا چاہیے پشت گرمی تجھے
کہ جاڑے سے پالا پڑا ہے مجھے

دل افسردگی سے بہت خستہ ہے
لہو ہر رگ و پے میں یخ بستہ ہے

مناسب ہے اب تجھ کو فکرِ علاج
پلا جرعۂ آب آتش مزاج

دوا دے کہ بیمار ہوں تندرست
طبیعت ہوئی کر جسے چاق و چست

مبارک رہے تجھ کو مے ساقیا
مجھے چاہیے اور تحفۂ ساقیا

وہ جوہر جو ہم رنگِ یاقوت ہے
لطافت میں ہم سنگِ یاقوت ہے

وہ شربت پلا مجھ کو اے رشکِ حور
جو ہے پاک مثلِ شرابِ طہور

دکھا جلوۂ لعبتِ چیں مجھے
سنگھا نکہتِ زلفِ مشکیں مجھے

نگارِ پریوش ہے جو شعلہ خو
اُسے دے کے لا مرے پاس تو

ارے کم پلا یا زیادہ پلا
مجھے اس گھڑی چائے سادہ پلا

ہے انجام سے متفق میری رائے
کہ نافع نہیں اس قدر شیر چائے

پئے گر کوئی زاہدِ خشک سر
ملا شیرۂ مغز بادامِ تر

ذرا اُٹھ کے ساقی مرے پاس آ
نئی داستاں سن یہاں بیٹھ جا

کہوں تجھ سے میں رات کی سرگذشت
سرِ شام نکلا جو کل بہرِ گشت

ہوا قہوہ خانے کی جانب گذر
وہاں میکدہ بھی اک آیا نظر

سڑک پر تو میں بیچ میں غم زدہ
اِدھر چائے خانہ اُدھر میکدہ

اُدھر سب مریدانِ پیرِ مغاں
اِدھر قہوہ و چائے کے قدرداں

وہ سب تر زباں اُس کی تعریف میں
یہ رطب اللساں اس کی توصیف میں

بالآخر یہاں تک بڑھی گفتگو   فریق اک ہوا دوسرے کا عدو
فریقین کرنے لگے پھر بیاں   عیوب ایک کے ایک کی خوبیاں
کہا ایک نے چائے ہے تلخ رو   کہا دوسرے نے کہ مے تند خو
کہا میکشوں نے ہے مے آفتاب   دیا چائے نوشوں نے تب یہ جواب
نظر اُس سے کرتی ہے کب خیرگی   بڑھاتی ہے عصیاں کی وہ تیرگی
اُنھوں نے کہا بادہ ہے لالہ فام   انھوں نے کہا محض صورت حرام
اُنھوں نے کہا غم غلط کُن ہے مے   انھوں نے کہا بے حیائی یہ ہے
اُنھوں نے کہا نشہ اس کا ہے مرد   انھوں نے کہا کور وقتِ نبرد
وہ بولے کہ مے کرتی ہے بے ہراس   یہ بولے کہ ہے وہ مُزیلِ حواس
وہ بولے بناتی ہے مے تر دماغ   یہ بولے نہیں۔ احمق و خر دماغ
وہ بولے ہے مے پردہ دارِ عیوب   یہ بولے کہ صورت نگارِ عیوب
وہ بولے کہ مے دانش افروز ہے   یہ بولے غلط وہ خرد سوز ہے
وہ بولے ہے مے غم گسارِ بشر   یہ بولے کہ ہے باعثِ دردِ سر
وہ کہنے لگے مے ہے وجہِ سرور   یہ بولے بناتی ہے وہ پُر غرور
وہ بولے نہیں کس جگہ دورِ مے   یہ بولے جہاں دورِ اسلام ہے
اُنھوں نے کہا بادہ ہے جم پسند   اِنھوں نے کہا چائے عالم پسند
کہا میکشوں نے کہ ہے چائے خشک   جواب اس کا پایا کہ مانندِ مُشک
بڑھی یہ حریفانہ بحث اس قدر   مے و چائے تک جس کا پہنچا اثر
کسی سے نہ پھر ہو سکا کچھ علاج   ہوئیں گرم دونوں وہ آتش مزاج
اُدھر اُس کے منہ پر کف آنے لگا   لہو جوش اِدھر اس کا کھانے لگا
ہوا دونوں کا رنگِ رخسار سُرخ   وہ آنکھیں تھیں یا جامِ سرشار سرخ

مے ناب کھانے لگی پیچ و تاب
کیا جام کی سمت پھر یوں خطاب

بڑی دیر سے ہیں جو مکار تے
طرفدار تیرے ہیں جھک مارتے

نہیں تو مقابل مرے حسن میں
یہ بیہودہ جی چاہے جتنا بکیں

مرے دم سے ہے گرم بازارِ حسن
کہ وجم ہیں میرے خریدارِ حسن

عجب ہے مرے حسن میں کیفیت
غضب ہے مرے حسن میں کیفیت

مرے بوسہ کا جو طلب گار ہو
تو ہو مست کیسا ہی ہشیار ہو

وہ ہے کون سا شاعرِ خوش بیاں
جہاں میں نہیں جو مرا مدح خوان

ہیں جنت میں ہم جنس میرے دخیل
مے کوثر و بادۂ سلسبیل

وطن کا مرے باغِ جنت ہے نام
وہیں کا ہے میوہ عنب لا کلام

تجھے مرتبہ یہ میسر کہاں
اری جام تو میری ہمسر کہاں

سنیں جام نے جب یہ باتیں کڑی
نہ تاب آئی آخر ابل ہی پڑی

کہا مے سے حسن او بد رسوختہ
ہے کیوں اس قدر تو برافروختہ

کہے دیتی ہوں میں کہ خاموش ہو
نہ اس طرح پر خود فراموش ہو

مرے آگے باتیں بناتی ہے تو
مجھے چٹکیوں میں اڑاتی ہے تو

مرے سامنے تیری ہستی ہے کیا
یہ قسمت کو روتی ہے ہنستی ہے کیا

حقیقت تری کیا ہے او زشت رو
عبث حسن پر اپنے نازاں ہے تو

جہنم میں عشاق جس کے جلیں
لگے آگ اس گرمیِ حسن میں

ترے حسن میں خاک ہے کیفیت
یہی اس کی ناپاک ہے کیفیت

ترے بوسہ کا ہے طلب گار کون
تجھے منہ لگاتا ہے مردار کون

تجھے مرد دیندار چھوتے نہیں
جو مومن ہیں ہشیار چھوتے نہیں

نہیں مدح خواں شاعرانِ فصیح
یہ سب کرتے ہیں تیری ہجوِ ملیح

غلط فہم تجھ کو بناتے ہیں سب — تسخر سے باتیں سناتے ہیں سب
کہاں تو کہاں کوثر و سلسبیل — ہر اک جنس میں ہیں شریف و رذیل
ملانے کو یوں تو ملا سلسلہ — تجھے اک جنت سے کیا سلسلہ
خدا تجھ پہ کرتا ہے لعنت مدام — کہ پیدا ہوئی ہے بہ آبِ حرام
ہے شاہد کلامِ حبیبِ خدا — کہ اُم الخبائث لقب ہے ترا
ذرا اس قدر خود ستائی نہ کر — نجس منھ سے اپنی بڑائی نہ کر
جوانوں سے بھڑتی ہے ناحق کو چیل — پری بنتی ہے اپنے منھ تو چڑیل
جو سیرا سلیماں سُنے یہ سخن — تو دے تجھ کو حکم جلائے وطن
ہوئی گفتگو جو مے و چائے میں — یہ ہے قولِ فیصل مری رائے میں
کہ جو کچھ کہا چائے نے سچ کہا — سر مو کہیں فرق اُس میں نہ تھا
عجب چیز ہے چائے اے ہم نشیں — کہ چاہ دنیا میں اس کی نہیں
مسلمان راضی ہنود اس سے خوش — رضامند ترسا یہود اس سے خوش
کوئی رند مشرب ہو یا پارسا — نہیں کس نے اس کا پیالہ پیا
اگر دردِ سر ہو تو ہے یہ دوا — یہ ہے خشکی کے لیے مومیا
دل افسردہ سے ہو جو گرم اختلاط — طبیعت میں پیدا ہو جوشِ نشاط
یہ اوصاف بنتُ العنب میں کہاں — یہ تہذیب اُس بے ادب میں کہاں
وہ احباب سے برسرِ شور و شر — یہ ہر ایک سے رہتی ہے شیر و شکر
بنائے وہ انساں کو غفلت شعار — یہ اُس کو سحر خیز و شب زندہ دار
وہ کم بخت غارت گرِ عقل و دیں — یہ آرائشِ بزمِ اہلِ یقیں
وہ کافر نجس، پاک و پاکیزہ یہ — وہ اک فاحشہ اور دوشیزہ یہ
کہاں مے کہاں یہ دل آرام خلق — یہ ممدوحِ عالم وہ بدنام خلق

یہ آب و نمک رنگ و روغن نہیں
کبھی دخترِ رز اس کا دھوون نہیں

مئے کہنہ سے دوں اسے کیا مثال
یہ اک نوجوان اور وہ پیر زال

یہ حسنِ گلو سوز اُس میں کہاں
جمالِ دل افروز اُس میں کہاں

جسے اس کا اک بوسۂ تر ملے
وہ نامِ مئے روح پرور نہ لے

جو بے منہ لگی جم کی وہ بے حجاب
تو بزمِ سلیماں میں یہ بار یاب

ہے تلخی بھی اس کی پسندِ انام
کہ وہ کرتی ہے پندِ ناصح کا کام

وہ تلخی کہ دل جس کا مشتاق ہے
کہ اَلْحَقُّ مُرٌّ کی مصداق ہے

ہے تلخی سے اس کے فقط یہ غرض
کہ دارُوئے تلخست دفعِ مرض

کب اس کی نگاہوں میں تُلتا ہے قند
سرِ بزم اس غم میں گھلتا ہے قند

کرے بے محابا جو بوس و کنار
جلا دے لبِ عاشقِ بے قرار

لڑائے جو اس شعلہ رو سے زباں
تو ہو داغدار اس کا کام و دہاں

سزا دیتی ہے دستِ گستاخ کو
جلا دیتی ہے دستِ گستاخ کو

کوئی مہرباں ہو کہ نامہرباں
سبھی سے یہ کرتی ہے دل سوزیاں

کھنچے گر یہ عشاقِ خوں گرم سے
پسینے پسینے ہو یہ شرم سے

گلاب اس کا ہم رنگ و بو میں کہاں
کرے لاکھ اگر وہ عرق ریزیاں

پلاتا ہے ساقی جو رنگیں زلال
تو لازم ہے اس بات کا بھی خیال

کہ جامِ بلوریں میں سر جوش ہو
مہِ نو شفق سے ہم آغوش ہو

نہ دے ظرفِ چینی خطا ہو معاف
کہ تقلیدِ اعجام کے ہے خلاف

صفتِ جامِ بلوریں کی کیا لکھوں
ہے بیروں نما اور صاف اندروں

اگر جام چند ایسے شفاف ہوں
مثالِ دلِ عارفاں صاف ہوں

بھرے ان میں ساقی کبھو رنگِ شوخ
نمودار پردہ سے ہو رنگِ شوخ

کسی میں بھرے صاف شفاف آب و رنگ جسے دیکھ کر اہلِ محفل ہوں دنگ
تماشائے نیرنگ نایاب ہو بہم جلوہ گر آتش و آب ہو
دو رنگی کا دنیا کے نقشہ دکھائے کرے محوِ رعنائیِ حُسن چائے
جو ہوں بزمِ رنگیں میں سب کو بہم نظر آئے کیفیتِ جامِ جم
شہِ جم کہ شاہِ سر افراز تھا اُسے اپنے اک جام پر ناز تھا
سلیماں کا اپنے ہوں ادنیٰ غلام مرے پاس ہیں ایسے اٹھارہ جام
وہ جام پسندیدۂ خاص و عام کہ فنجانِ بلور ہے جس کا نام
وہ فنجان ہیرے کے ترشے ہوئے کہیں خوشنما جامِ جمشید سے
لبالب جو ہوں رنگ سے واہ واہ شفق گوں نظر آئیں اٹھارہ ماہ
وہ چمچے شکر ریزِ کام و دہاں لڑائیں جو شیریں لبوں سے زباں
وہ ساغر کشتی کے لیے کشتیاں سبک سیر مانندِ تختِ رواں
جو ہو شور افزا لبِ بحرِ شوق پہنچ جائیں یہ تا لبِ بحرِ شوق
برنجی وہ اک خوشنما کیتلی کہ ہے چائے نوشوں کی جو لاڈلی
حقیقت میں سر چشمۂ فیض ہے دل اُس کا مگر چشمۂ فیض ہے
بڑے حوصلے کے بڑے ظرف کی کہاں یہ بطے میں دریا دلی
وہ اک مجمرِ آہنی چشمہ دار ہے دل دیکھنے کو جسے بے قرار
جو سردی کو دے گرم ہو کر شکست بنائے زمانے کو آتش پرست
ذرا اُس میں سُلگے اگر عود خام معطر ہو خوشبو سے محفل تمام
تکلف کی چیزیں یہ سب ساقیا رہ آوردِ ملکِ عرب ساقیا
عطیاتِ شہزادۂ لکھنؤ سلیماں لقب دام اقبالہٗ
خدا کی قسم قابلِ دید ہیں یہ کل اے صنم قابلِ دید ہیں

یہ اسباب مطلوب ہوں گر تجھے
تو حاضر ہیں حجت نہیں کچھ مجھے

ہے موجود تیرے لیے ساقیا
مگر طاقِ نسیاں پہ رکھا ہوا

نہ ہو تجھ کو باور جو اے مست ناز
تو چل ساتھ میرے بہ عجز و نیاز

حضورِ خداوندِ فیروز بخت
سلیماں حشم وارثِ تاج و تخت

کہ تجھ کو اگر شوقِ تحقیق ہو
مری راست گوئی کی تصدیق ہو

بفرمانِ آقائے فرخ لقا
منگاؤں وہ صندوق اسباب کا

بجا لاؤں آداب با صد ادب
حوالے کروں تجھ کو ساز طرب

سماوارِ روسی کی ہے گرچہ فکر
حضوری میں آ جائے اس کا بھی ذکر

وہاں ہوں گے بیسوں ہی ایسے پڑے
بھی وضع و ہیئت کے چھوٹے بڑے

بہر کیف جو ہو عنایت تجھے
وہ ہے باعثِ فخر و عزت تجھے

دعا گوئے شاہِ عطا پیشہ ہے
تو کیوں عرضِ مطلب میں اندیشہ ہے

سوال آج خالی نہیں جائے گا
جو تو مانگتا ہے وہی پائے گا

مبارک تجھے ساقیا بزم عیش
کر آراستہ جا بجا بزم عیش

دعا دل سے دے میرے سرکار کو
سمجھ زیبِ محفل سماوار کو

سماوار ہے رونقِ انجمن
جہاں بزم میں یہ ہوا جوش زن

اسی وقت سردی ہوا ہو گئی
بلند ایک دلکش صدا ہو گئی

صدا وہ کہ جس میں بھرا ساز و سوز
خجالت وہ نغمۂ نیم روز

تحمل ہے سوزِ نہاں کا اسے
نہیں خوف کچھ امتحاں کا اسے

جو انجن سُنے اس کی سرگرمیاں
تو اُڑنے لگے اس کے منہ سے دھواں

وہ رکھتا ہے گو سینۂ شعلہ بار
پر اس کی طرح کب ہے اس کو قرار

اگر امتحاں ضبط کا ہو کہیں
تو وہ چیخ کر بھاگ جائے وہیں

نہ اب دیر ساقیٔ پُر فن کرے سماوار کو جلد روشن کرے
رہے زیبِ پہلو مرے دل کی طرح سماوار ہے گرم محفل کی طرح
نہ چوکے اگر گرم پڑیں کر ٹلے رقیبِ سیہ رو کا منھ پھونک دے
جو ہنس ہنس کے ہو مجھ سے گرمِ تپاک عدو آتشِ غم سے ہوں جل کے خاک
شکر ریزیٔ خندۂ لعلِ تر کرے آتشِ شوق کو شعلہ ور
مہیا ہو جس دم یہ سامانِ چائے کروں دعوتِ جرعہ نوشانِ چائے
بھروں چائے فنجانِ بلور میں اتاروں پری شیشۂ نور میں
بہم خوب ہی گرم جوشی رہے غزل خوانی و بادہ نوشی رہے
دل دوس کے اثر سے ادھر گرم ہوں دعائے سلیماں میں سرگرم ہوں
زبانِ خرد پر ہو نظمِ صفیؔ کرے نذرِ سرکار یہ مثنوی
عجب صاف و شیریں ہے یہ نظمِ تر کہیں کیوں نہ قنداب صاحب نظر

کہ لذت دہِ کامِ احباب ہے
حلاوت میں ہم وزنِ قنداب ہے

نوٹ:۔ یہ مثنوی "قنداب" کے عنوان سے مطبع گلشنِ فیض، مولوی گنج لکھنؤ سے سنہ ۱۳۱۱ھ میں ایک کتابچہ کی شکل میں چھپی تھی۔ حالانکہ صفیؔ لکھنوی اس کو سنہ ۱۳۰۶ھ میں نظم کر چکے تھے۔ یہ مثنوی عالی جناب شہزادہ مرزا ہمایوں قدر بہادر کے حکم سے سید مقبول حسین ظریف نے شائع کرائی تھی۔ اس مثنوی کے آخر میں صفیؔ لکھنوی کا ایک فارسی قطعہ تاریخ ہے۔ اس کے علاوہ ۱۲ اور تاریخی قطعات ہیں۔ اس مثنوی کی وجہ تصنیف ان کے چھوٹے بھائی سید مقبول حسین ظریف نے یہ لکھی ہے:۔

"یہ مورِ ناتواں حاشیہ بوسِ بساطِ سلیماں سفرِ عراق میں ہم رکابِ فیض انتسابِ حضور لامع النور سرکارِ دولت مدار حضرت شاہزادہ میرزا سلیماں قدر بہادر دام اقبالہٗ و عمّ نوالہٗ تھا۔ حسب

عادتِ مستمرہ اس سفر میں بھی جا بجا ہزارہا روپیہ کے تحائف بندگانِ عالی نے خرید فرمائے۔ منجملہ اُن کے اعلیٰ قسم کے بیش بہا ظروفِ چائے نوشی بھی تھے جو کہ خرید ہو کر مع ملبوساتِ سرمائی اس خادم کو عنایت ہوئے یہ ظروفِ دل پسند ایک صندوق میں بند سرکاری اسباب کے ہمراہ عند المراجعت سہواً داخلِ تحویل ہو گئی یہاں تک کہ موسم سرما کی شدت ہوئی اور زمانہ سرد مہر کے ہاتھوں تکلیفِ انتظارِ وصولِ عطیات اٹھانا پڑے۔ ایک روز اس کا تذکرہ اخیِ معظم اُستاد مولانا سید علی نقی صاحب صفؔی مدظلہ العالی آیا اور کمترین نے یہ خواہش ظاہر کی کہ در بابِ یاد دہانیِ عطیات آپ مجھ کو لکھ دیں۔ چنانچہ براہِ شفقتِ بزرگانہ باوجود عدیم الفرصتی بہت جلد جنابِ معظم نے ایک ساقی نامہ بطرزِ جدید بنا بر ہدیۂ مخمسہ الیہ نظم فرما دیا جس میں مئے و چائے کا مباحثہ مصنف کا محاکمہ مقاماتِ مناسب پر تعریف سرکار مدوح الصفات بعنوانِ شائستہ یادآوری عطیات بہ پیرایۂ حسنِ طلب ادائے مطلب قابل دید ہے۔ اس مثنوی عدیم المثل کی خوبی اسی سے ظاہر ہے کہ بجردِ ملاحظہ اس قدر پسند طبع اقدس و اعلیٰ ہوئی کہ علاوہ عطیات مطلوبہ بہت کچھ دادِ سخن دی گئی اور بہ فیاضی و قدر دانی مرشد زادۂ فیض گستر ہنر پرور جناب میرزا ہمایوں قدر بہادر دام دولتہ و حشمتہ اس کی طبع و اشاعت کی گئی۔ الٰہی دعائے کامگاری سلیمانِ کامرانی شل عرض مقبول قبولی فقط "

ظریؔف لکھنوی خود بھی اعلیٰ مرتبت شاعر تھے جنکی شاعری کا ڈنکا بج رہا تھا۔ لیکن انھیں یقین تھا کہ مقصد کی برآری کے لیے جس اثر کی ضرورت ہے وہ اثر ان کی شاعری میں پیدا نہ ہو سکے گا اور اسی لیے اپنے برادرِ معظم اور استادِ محترم جناب صفؔی لکھنوی سے ایک نظم کے لیے درخواست کی۔ یہ صفؔی کے نظموں کی اثر آفرینی تھی جس نے ظریؔف کو نظم تصنیف کرنے کے لیے استدعا کرنے پر مجبور کیا۔

سید زائر حسین کاظمی

عقدِ پروین

پھیلے ہوئے فضائے جہاں میں ہزار ہا / ذرّے ترے ستارے ہیں اے خاکِ بارہا [1]
ساداتِ ذی وقار کا بیت الشرف ہے تو / اک ہند میں خزانۂ دُرِ نجف ہے تو
جرأت کو تجھ پہ فخر شجاعت کو تجھ پہ ناز / ہندوستاں میں تری زمیں تختۂ حجاز
خود جلوہ گر ہے وہ ترے پاکیزہ نام سے / ہے جو خصوصیت تجھے بارہ امامؑ سے
بعدِ زوال پھر ہو مبارک تجھے عروج / بارہ یہ بستیاں کہ سیادت کے ہیں بروج
تاریخ کی لگائی جب آنکھوں نے دوربیں / دیکھا ستارہ ایک قمر جلوہ مہ جبیں
ڈوبا ہوا ہے سیادت میں جس کا نُور / جس کی شعاعِ سبز پہنچتی ہے دور دور
وہ ماہِ مہر شاہِ ولایت سے مستنیر / اپنی ہی خود ثوابت و سیار ہیں نظیر
وہ آفتاب عام نگاہوں کی حد سے دور / اب تک سدا ہے سات [2] حجابوں میں جس کا نور
تصدیق دل نے کی کہ سیادت پناہ ہے / بے شبہ یہ سپہرِ جلالت کا ماہ ہے
شامل ہے یوں بزمرۂ سادات بارہا / جیسے قمر کے گرد ستارے ہزار ہا
اب کیا ہے جو دعائیں ہوئیں سب کی مستجاب / بیت الشرف میں پھر ہوئی تحویلِ آفتاب
ہے ذاتِ پاک حضرتِ نوابِ نامدار / ہم بوترابوں کے لیے وجہِ افتخار
یارب سدا ہے زمانہ میں قائم یہ رکنِ دیں / سردارِ شیعیان و مددگارِ مومنیں
ہندوستاں میں کوئی نہیں ایسا دوسرا / یہ ہے جہازِ ملّتِ بیضا کا ناخدا

---

[1] بارہہ (بارہا) ضلع مظفر نگر میں ایک قصبہ ہے جہاں پر سادات آباد ہیں۔ سید عبداللہ اور سید حسین علی کا تعلق یہیں سے تھا جو تاریخ میں سید برادران بادشاہ گر کے نام سے مشہور ہوئے۔

[2] سات حجاب سے مراد ہیں۔ ۱۔ نواب علی محمد خاں ۲۔ نواب فیض اللہ خاں ۳۔ نواب غلام محمد خاں ۴۔ نواب محمد سعید خاں ۵۔ نواب یوسف علی خاں ۶۔ نواب کلب علی خاں ۷۔ نواب مشتاق علی خاں۔

ہز ہائنس کا ذکر جو ہے زینتِ کلام
ساقی پہ فرضِ عین ہے اس وقت دورِ جام

واللہ یادگار ہے یہ محفلِ سرور
رونق فزا ہیں حضرتِ نوابِ رامپور

یہ بھی۔ برادرانہ محبت کا ہے نباہ
ذرّوں کا میہماں ہے جو مہرِ سپہر جاہ

یکساں ہے دیکھو دونوں طرف چشمِ التفات
پرتاب گڑھ[2] سے آئی جو ہے جانسٹھ[1] برات

مہماں مرے حضور یہاں بھی وہاں بھی ہیں
مستِ مئے سرور یہاں بھی وہاں بھی ہیں

کیوں کر نہ ہو خیالِ مداراتِ جانبین
دولہا بنا ہے حضرتِ ہادی کا نورِ عین

گلزارِ عز و جاہ کا وہ سروِ خوش خرام
منجھو ہے جس کا عرف محمد حسینؑ نام

شادی ہوئی ہے بنتِ مظفر علی کے ساتھ
وقتِ کرم ہے ابرِ گہربار جن کا ہاتھ

سید بھی ہیں رئیسِ مظفر نگر بھی ہیں
ذی حوصلہ بھی اور بڑے ذی اثر بھی ہیں

نوشہ عروس دونوں سیادت کے پھول ہیں
ساداتِ بارہ سے ہیں آلِ رسولؐ ہیں

ہادی مرے مکرم و مخدوم و محترم
فرما چکے ہیں عقد کی تاریخ جو رقم

ضمناً صفی یہ مصرعِ برجستہ لکھ نہ دو
گلدستۂ نشاط میں یک رنگ پھول دو
۱۳۳۲ھ

کہہ دو کہ دی ہے سال مسیحی نے یہ نوید
بے مثل ایک رشتہ میں دو گوہرِ امید
۱۹۱۴ء

ساقی پلا شراب ترے میکدے کی خیر
جو تو ہے دیکھ ہم بھی وہی ہیں نہیں ہیں غیر

ہے تجھ سے ہم کو سلسلۂ ربطِ معنوی
اک شاخ واسطی ہے تو اک شاخ غزنوی

عیسیٰ ابن زید حضرتِ شہزادہ احسینؓ
ہیں دونوں زید ابن علیؑ کے یہ نورِ عین

شہزادہ حسین کا ذو الدمعہ ہے لقب
منسوب انھیں سے غزنویوں کا حسب نسب

۱؎ ضلع مظفر نگر میں جانسٹھ ایک تحصیل اور قصبہ ہے۔ نواب مظفر علی خاں یہاں کے رئیس تھے جن کی صاحبزادی سے منجھو میاں کا عقد ہوا تھا۔

۲؎ خان بہادر سید محمد مہدی، ڈپٹی کمشنر ضلع پرتاپ گڑھ سے مراد ہے جن کے لڑکے جناب سید محمد حسین عرف منجھو صاحب کی شادی خانہ آبادی کے موقع پر صفی لکھنوی نے یہ نظم کہی تھی۔

غزنی سے آئے شاہِ مبارک[1] جو سوئے ہند
خاکِ قدم سے ان کے بڑھی آبروئے ہند

دہلی میں ان کا نام و نشاں برقرار ہے
بالائے حوضِ شمسی ابھی تک مزار ہے

بینگوڑیوں کے مورثِ اعلیٰ بڑے ولی
اولاد میں انھیں کے ہیں سید جلال بھی

شاخیں جدا جدا ہیں مگر ایک ہے چمن
اجداد کا ہمارے بھی بینگوڑ تھا وطن

جاٹوں کی تیغِ ظلم سے جب خوں میں نہائے
چھوڑا وطن بزرگ ہمارے اودھ میں آئے

دل سے قریب گو کہ بظاہر بعید ہیں
ہم بھی چراغِ مشہدِ زید الشہید ہیں

کیوں سن لیا تمام نسب نامہ ساقیا
اب کیا ہے حکمِ مفتیٔ علامہ ساقیا

وہ آ رہا ہے جام ادھر گھومتا ہوا
اُٹھا ہے ابرِ توبہ شکن جھومتا ہوا

آئی جو ہے بہار تو زوروں پہ ہے نمو
مے پی نہیں کہ بڑھنے لگا چلوؤں لہو

اُن زاہدانِ خشک سے کیا کام جو ہیں لٹھ
دورِ مئے دو آتشہ ہم اور جالنٹھ

فصلِ بہار شبنم و گل بشیشہ در بغل
پڑھتے ہیں رندِ بحرِ تقارب میں یہ غزل

غزل

غزل اس نے چھیڑی مجھے ساز دینا
ذرا عمرِ رفتہ کو آواز دینا

قفس لے اُڑوں میں ہوا اب جو سنکے
مدد اتنی اے بالِ پرواز دینا

دیا تھا جو کل نرگسی انکھڑیوں میں
وہی سرمہ پھر اُو فسوں ساز دینا

نشانہ کی زد پر جب آ جائے کوئی
تو مہلت ذرا ناوک انداز دینا

یہ دل سادہ لوحی سے ہے تیرے بس میں
نہ اس کو دغا فتنہ پرداز دینا

پلانا مجھے ہاتھ سے اپنے ساغر
سرِ بزم تمغائے اعزاز دینا

مرے سر پہ ہے دامنِ گل کا سایہ
کسی کو نہ چھاں اس کی ہمراز دینا

---

[1] شاہ مبارک سے مراد سید نور الدین المعروف بہ شاہ مبارک ہیں جو غزنی سے ہندوستان آئے

کوئی سیکھے دل کی بیتابیوں سے ہر انجام میں رنگ آغاز دینا
دل آویز سہرے کو دینا ہے جلوہ
صفیؔ دادِ نطق خدا ساز دینا

سہرا

حسن مستانہ اداؤں کا ترے سر سہرا
زلف دلکش ہے مگر زلف سے بڑھ کر سہرا

بھینی بھینی وہ مہک وہ اثر عطر عروس
اس پہ طرّہ رخ نوشہ پہ معطّر سہرا

دیکھنا سیر کہ دامن پہ بچھا جاتا ہے
نگہ ناز کہ ہے پھولوں کا بستر سہرا

رکھ لیا ہنس کے جو نوشاہ نے منہ پر رومال
کہہ گیا کان میں کیا چہرہ سے ہٹ کر سہرا

چشم بد دور جوانی ہے بڑے زوروں پر
اور سنبھالے ہوئے اس زور کا لشکر سہرا

رخ سے اٹھتا نہیں گو آرسی مصحف کا ہے وقت
اللہ اللہ یہ مغرور یہ خود سر سہرا

مہر انور کی شعاعوں سے الجھ پڑتا ہے
زور پر جلوۂ رخسار کے پر زر سہرا

۱؎ "صحیفۂ الغزل" مرتبہ شیخ ممتاز حسین جونپوری اور غزلیات کا مکمل نسخہ جو اب راقم السطور کے پاس ہے اور جس کو مولانا صفیؔ لکھنوی نے اپنی نگرانی میں لکھوایا تھا میں اس غزل کی سالِ تصنیف بالترتیب ۱۹۱۲ء اور ۱۹۱۳ء درج ہے لیکن غزل کے مقطع سے صاف ظاہر ہے کہ یہ غزل عقد کے وقت کہی گئی تھی اور عقد ۱۹۱۴ء میں ہوا تھا جیسا کہ تاریخ عیسوی اس شعر سے نکلتا ہے ؎

کہہ دو کہ یہی ہے سالِ مسیحی نے یہ نوید
ہے مثلِ ایک رشتہ میں دو گوہر امید
۱۹۱۴ء

غزل کا مقطع اس بات کا ثبوت دے رہا ہے کہ یہ غزل عقد کی مخصوص تقریب کے وقت نظم کی گئی تھی ورنہ دل آویز سہرے کا ذکر کرنے سے کیا حاصل تھا۔ صفیؔ لکھنوی نے جو اس غزل کی سالِ تصنیف ۱۹۱۲ء لکھوائی ہے وہ لغزشِ قلم معلوم ہوتا ہے۔ سید زائر حسین کاظمی

باندھیے شوق سے لے خان بہادر بادی　　آج فرزندِ جواں سال کے سر پر سہرا

تازہ گلہائے مضامین سے جو گوندھا ہے شفقؔ

رنگِ اخلاص میں ڈوبا ہے سراسر سہرا

سہرے کا رنگ چاہیئے ساقی شراب دے　　پُرزور ہو جو مے تو ملا کر گلاب دے

دے طاق سے اتار کے رندانِ مست کو　　وہ شیشہ جس پہ ساقیٔ کوثر کی مہر ہو

قاضی کا خوف ہے نہ ہمیں محتسب کا ڈر　　پھر مے کُھلے خزانہ پئیں کیوں نہ بیٹھ کر

برقی چراغ ہیں دلِ رندانِ خوش مزاج　　بجلی کی روشنی ہے مرے میکدے میں آج

سادات جتنے جمع یہاں ہر طرف کے ہیں　　ترشے ہوئے نگینے یہ دُرِّ نجف کے ہیں

پھیلی ہوئی ہے نورِ ولائے علیؑ کی ضو　　مانندِ شمعِ طور زباں دے رہی ہے لَو

ہر مستِ عشق اپنے زمانہ کا ہے ولی　　دل میں علیؑ علیؑ ہے زباں پر علیؑ علیؑ

جنبش زباں کو منقبتِ پنجتن میں ہے　　موجِ زلالِ چشمۂ کوثر دہن میں ہے

سادات زیدیہ یہ جوانانِ حیدریؑ　　نامِ خدا مُغانِ غدیری و کوثری

ہم سب غدیرِ خم کے شرابی ہیں ساقیا　　فرقت کے دن گئے وہ حسابی ہیں ساقیا

ہے آج میکشوں کو ترے میکشی کی دُھن

دروازہ کھٹکھٹا کے یہ کیا کہہ رہے ہیں سُن

قطعہ

ساقی! شراب خانۂ خمِ غدیر سے　　دے بادہ صاف ترسخنِ دلپذیر سے

وہ بادہ جبرئیلِ امینؑ لائے تھے جسے　　خم خانۂ ودیعتِ ربِ قدیر سے

وہ تُند مے کہ جو سرِ خم جوش زن رہی　　پیہم لبِ جناب بشیر و نذیر سے

وہ مے کہ جو بحکمِ خداوند نشأتین　　پی تھی سبھوں نے دستِ رسولؐ کبیر سے

وہ بادۂ لطیف کہ تھا جس میں آب و رنگ — جوشِ ولائے شاہِ ولایت سریر سے
وہ مے کہ جس کے نام کا خطبہ پڑھا گیا — پی دل نے جام گوشِ نصیحت پذیر سے
منبر پہ جس شراب کے شربِ مدام کی — تاکید کی رسولؐ نے جمِ غفیر سے
رضواں کے منہ سے آتی ہے جس مے کی بوئے خوش — وہ مے جو بہہ رہی ہے لبِ جوئے شیر سے
وہ مے جو موج خیز ہے جوشِ نشاط میں — وہ مے جو ابل پڑتی ہے خمِ غدیر سے
وہ مے جو دوستوں کو ہے سرمایۂ بقا — وہ مے جو دشمنوں کو زیادہ ہے تیر سے
وہ مے کہ جس کا منقبتِ مرتضیٰؑ ہے نام — وہ مے کہ جو کھنچی ہے ولا کے خمیر سے
دستِ خدا کے ہاتھ سے پھرتے ہیں سب کے دن — روشن ہے صاف قدرتِ مہرِ منیر سے
عاجز نوازیاں مرے مولا کا تھا شعار — کیا کیا کئے سلوک یتیم و اسیر سے
دنیا کی لذتوں کو لگایا کبھی نہ منہ — مطلب تھا ایک گردۂ نانِ شعیر سے
چھوڑا نہ دین نے کبھی سلطانِ دیں کا ساتھ — دنیا رہی خلافِ نبیؐ کے وزیر سے
صفین و بدر، خیبر و خندق، احد کہیں — سر بر ہوا کوئی نہ شہِ قلعہ گیر سے
پیوند جس میں سیکڑوں ملبوس وہ خشن — تھا بوریا سے کام نہ شہ کو حریر سے
ملحوظ اوڑھنے میں بچھونے میں سادگی — مجبور اک گلیم سے اور اک حصیر سے
دنیا سے بے نیاز زمانہ کے چارہ ساز — کونین کے امیر بظاہر فقیر سے
کیا خوفِ معصیت کہ فنا فی العلیؑ ہوں میں — قطرے کو اتصال ہے آبِ کثیر سے
دل کا وہ حال ہے کہ جو کھینچوں اک آہِ سرد — برساؤں آگ ابھی کرۂ زمہریر سے
تیغِ اصیل ہوں مگر آلودہ زنگ میں — جوہر ابل پڑے ہیں یہ جوشِ ضمیر سے
سر پنجۂ سپہر کروں گا ابھی نگار — دبنے کا میں نہیں فلکِ سخت گیر سے
ہوں کشتِ خشک تشنۂ شبنم نہیں مگر — چشمِ کرم ہے ریزشِ ابرِ مطیر سے
خدمت گزارِ قوم ہوں عزلت گزین فقیر — امیدِ فیض لطفِ جناب امیر سے

گو بے نوا ہوں سکۂ رائج مگر سخن — موجِ گہر خجل مری موجِ حصیر سے

نظمِ صفی کے حضرتِ ہادی ہیں قدرداں
لطف اس کا پوچھے کوئی مرے ہم صفیر سے

نوٹ :- یہ پوری نظم "عقد پروین" جس میں نظم، غزل، سہرا اور قطعہ شامل ہے فل اسکیپ سائز پر نور المطابع لکھنؤ سے زیرِ اہتمام سید عابد حسین کاشف رضوی، ڈرائنگ ماسٹر شائع کرا کے جناب محمد حسین عرف منجھو صاحب کے عقد کے موقع پر تقسیم کی گئی تھی۔ جس کی ایک کاپی مرتب کے پاس موجود ہے۔

سید زائر حسین کاظمی

آغوشِ مادر

دل وہ پتھر ہے جسے ماں کی محبت نہ ہوئی — خاک دنیا پہ جو دنیا میں یہ نعمت نہ ہوئی
جب تک اس پردہ میں تحریکِ مشیت نہ ہوئی — پیکرِ خاکیٔ انساں تیری خلقت نہ ہوئی

کس نے اے خاک کے پتلے یہ سب احسان کیے
دکھ سہے تیرے لیے درد سہے تیرے لیے

جب خبر لی کہ تجھے اپنی خبر بھی تو نہ تھی — قائم اک مرکزِ بینش پہ نظر بھی تو نہ تھی
دوش کو تابِ گراں باریٔ سر بھی تو نہ تھی — مشکل گردن ترے قابو میں کمر بھی تو نہ تھی

پاؤں کہنے میں کوئی تھا نہ ترا ہاتھ اس وقت
یہ تو بتلا کہ دیا کس نے ترا ساتھ اس وقت

دو برس خون پلا کر تجھے پالا کس نے — دونوں پیارے سے ہاتھوں پہ اچھالا کس نے
منہ سے گرنے لگا جب تو سنبھالا کس نے — پرورش کی تری جھیلا یہ کسالا کس نے

جبکہ چھوٹے بھی نہ تھے اپنے پرائے تجھ کو
کون پھرتا تھا کلیجہ سے لگائے تجھ کو

تری انگلی جو دکھی ہو گئی بے تاب وہ ماں ماتا آگ تو دل جوہر سیماب وہ ماں
شیر لب پر ترے تلخ اس کو شکر خواب وہ ماں ہمہ تن تیرے لیے عالم اسباب وہ ماں

دیکھ کر گود میں صورت تری پیاری پیاری
دودھ کی جنت فردوس میں نہریں جاری

علم ہو عقل ہو یا حسن ہو دولت ہو کہ رسن رشک ان باتوں میں اولاد پہ کیا ہو ممکن
سر پہ ماں باپ کا سایہ ہے وہ نعمت لیکن اپنی اولاد پہ رشک آتا ہے خود ہو کے مُسِن

کہ وہ دو مہر و محبت کے فرشتے نہ رہے
حرزِ بازو تھے جو اب تک وہ نوشتے نہ رہے

جس طرف دیکھیے دنیا ہے اور اپنا مطلب دل کی حالت کا نہیں پوچھنے والا کوئی اب
تیرے بندہ کے وہ دو ربِ مجازی یا رب کیا ہوئے نشو و نما کا جو بظاہر تھے سبب

تھی مسرت سے مسرت جنھیں غم سے غم تھا
روح پرور انھیں عیسیٰ نفسوں کا دم تھا

خاص کر ماں وہ محبت کی مجسم تصویر آیۂ رحمت خالق کی مکمل تفسیر
پرورش کے لیے اولاد کی سرچشمۂ شیر چارہ سازِ دلِ رنجور بہ حسنِ تدبیر

پردۂ شیر میں جس ماں نے دکھائے نیرنگ
خون دوڑا کے بھرا پیکرِ بے رنگ میں رنگ

وہ ادا فہم و زباں دانِ صغیر نادل مہر انگیز نگاہوں سے سوئے رخ نگراں
دودھ پیتے ہوئے بچہ نے جہاں کی غوں غاں ہوتی بے ساختہ لے لے کے بلائیں قرباں

نطقِ طفلانہ کا مفہوم سمجھنے والی
خواہشاتِ دلِ معصوم سمجھنے والی

سرِ گہوارہ کبھی رمز شناس آواز کبھی افسونِ اشارات سے افسانہ طراز

...ر زبان گاہ تکلم کے انوکھے انداز — گاہ دل باختہ، شعبدہ، ناز و نیاز

الغرض روز یہی آٹھ پہر کام اُسے
دکھ سے دکھ اور ترے آرام سے آرام اُسے

تیری ہستی میں تمام اس کی امیدیں محدود — تیری تسلیم کو سمجھے ہوئے اصل مقصود
بس یہی فکر کہ حاصل ہو تجھے نام و نمود — خادمانہ تری خدمت کے لیے خود موجود

اپنی راحت پہ مقدم تری راحت اس کو
وحشت انگیز تری سیر و سیاحت اس کو

اک ذرا آنکھ سے اوجھل ہوئی صورت تیری — دل کو تڑپانے لگی اس کے محبت تیری
اور پھرنے لگی آنکھوں میں شباہت تیری — جس کو اتنی بھی گوارا نہ ہو فرقت تیری

ساتھ چھوٹ جائے جو اُس ماں کا تو غم ہو کہ نہ ہو
خون دل ہو کہ نہ ہو آنکھ یہ نم ہو کہ نہ ہو

سو برس کی بھی تری عمر اگر ہو جائے — ماں جو زندہ ہے تو سمجھے گی وہ بچہ ہی تجھے
دونوں یکساں ہیں اُسے تو ہو کہ تیرے بچے — نگراں وہ ہے تجھے کام نہیں کچھ گھر سے

اُس کے انعام کی محتاج تیری فرزندی
اُس کے احکام کی تعمیل سعادتمندی

تجھ سے بڑھ کر تری اولاد کی ہر دم نگراں — نونہالانِ چمن زاد کی ہر دم نگراں
ساز و سامانِ خدا داد کی ہر دم نگراں — کل ترے خانۂ آباد کی ہر دم نگراں

خانہ داری کا ترے بوجھ بٹانے والی
خون اپنا انھیں فکروں میں گھٹانے والی

وہ تری ناصح مشفق وہ تری خیر اندیش — ناخدا گھر کی ترے سب کی معلم کم و بیش
اُس کے الطاف نہاں مرہم زخم دل ریش — چاہے سلطان زماں ہو کوئی چاہے درویش

دونوں کے واسطے یکساں ہے یہ نعمت یکساں
دونوں کے سر پہ ہے یہ سایۂ لطفِ یزداں

نام لیکر وہ محبت سے بلانا تجھکو
پھیرنا پیٹھ پہ ہاتھ اور بٹھانا تجھکو
زینت رکھنا کوئی چیز اور کھلانا تجھکو
کبھی خوش ہو کے کلیجے سے لگانا تجھکو

خواہ رتبہ ترا کیسا ہی نہ کیوں ہو اعلا
تو مگر اُس کی نگاہوں میں وہی ہے کہ جو تھا

جو کہ ہو روز ولادت ہی سے دم ساز ترا
جس پہ مخفی نہ ہو پوشیدہ کوئی راز ترا
جن نگاہوں میں ہو طفلانہ وہ انداز ترا
کیا کھنچے ان میں بزرگانہ اعزاز ترا

مختلف حلقوں میں دیکھی ہے اسیری تیری
بچپنا تیرا جوانی تری پیری تیری

تاجِ شاہی سر فرزند کو دستِ شفقت
سایۂ لطف خدا ظلِّ ہمائے دولت
آسمانی برکت رحمت رب العزت
بخدا جس کی تلافی نہیں ایسی نعمت

پوچھیے دل سے اُسی کے جسے آگاہی ہے
ماں کا زانو ہی حقیقی تخت شہنشاہی ہے

چھین لے دستِ اجل جس سے کہ یہ تاج یہ تخت
کیا کرے وہ جو شب و روز نہ روئے یک لخت
آسماں دور ہے دور آہ زمیں سخت ہے سخت
مانتا ہے مگر اس غم میں کہیں دل کم بخت

کیا کرے گا کوئی اس سینہ گداز غم کا علاج
نہ مسیحا سے ہوا فرقتِ مریم کا علاج

پھرتی ہے آہ جب آنکھوں میں وہ دلکش تصویر
آتی ہے گوشِ تصور میں صدائے تقریر
وہ صدا جس میں محبت نے بھری تھی تاثیر
گدگدا کر جو کیا کرتی تھی دل کو تسخیر

کان ممنون ہیں جس جنبشِ لب کے اب تک

بھولتے کے نہیں ہم زندہ رہیں گے جب تک

ناصحانہ ادب آموز وہ انداز نظر عنصر لطف و غضب جس میں بہم شیر و شکر
ایک چلتا ہوا جادو جو موثر دل پر تھیں کبھی جس کے کرشموں کی یہ آنکھیں خوگر

نظر آتا ہے سب اس نقش خیالی میں صفی
خواب دیکھا تھا مگر بزم مثالی میں صفی

ہائے وہ ہاتھ کبھی پیٹھ جو سہلاتے تھے متنبہ کبھی ہم جن سے کیے جاتے تھے
وقت پڑتا تھا اگر ہم پہ تو کام آتے تھے اٹھ کے راتوں کو دعاؤں میں جو تھراتے تھے

نظر آتے ہیں مگر کام نہیں دے سکتے
دل بیتاب کو آرام نہیں دے سکتے

یوں تو صورت کدۂ دل میں ہیں صد ہا تصویر دل میں صفحۂ تاریخ ہے اک با تصویر
اس کا ہر داغ جداگانہ ہے گویا تصویر پردہ پردہ کو جو دیکھیں تو سراپا تصویر

اس مرقع میں مگر نقش ہیں دو ہی خوشتر
صورت مادر محبوبۂ و محبوب پدر

ہائے ان دونوں بزرگوں کو کہاں سے لائیں اب جو عالم ہے وہ کس طرح انھیں دکھلائیں
لے گئے ساتھ گراں قدر سب اپنی رائیں کاش پھر آ کے بزرگانہ ہمیں سمجھائیں

کان میں آئیں خوش آیند صدائیں اُن کی
دیں تسلی دل مضطر کو دعائیں اُن کی

روز دونوں ہمیں ہر کام میں یاد آتے ہیں چند بار اک سحر و شام میں یاد آتے ہیں
شب کے آغاز میں انجام میں یاد آتے ہیں دکھ میں یاد آتے ہیں آرام میں یاد آتے ہیں

خم کسی دست نوازش کو جہاں دیکھ لیا
آنکھ نے اپنے ہی بچپن کا سماں دیکھ لیا

جن کو حاصل برکت اور یہ نعمت، ہو صفیؔ — وہ عزیزانِ وطن قدر کریں قدر اُن کی
یہی پہچان ہے جتنے ہیں سعیدِ ازلی — ہو نہ ماں باپ کی خدمت میں اطاعت میں کمی
کہ اسی بات کی حاجت انھیں ہو گی اک دن
کس سے؟ اولاد سے گھر بیٹھیں گے جب ہو کے مسن

سلبِ نعمت سے جو ہوں مثل ہمارے مغموم — وہ کبھی تحصیلِ سعادت سے رہیں کیوں محرو
ہے اگر الفتِ مرحومہ و پاسِ مرحوم — نہ کریں ترک کبھی فاتحہ خوانی کے رسو
اپنے ماں باپ کا حق جو نہ کبھی بھولیں گے
وہی اس گلشنِ ہستی میں پھلے پھولیں گے

نوٹ:- یہ نظم غالباً سنہ ۱۳۱۷ھ یا سنہ ۱۳۱۸ھ میں لکھی گئی تھی۔ صفیؔ لکھنوی کی والدہ کا انتقال سنہ ۱۳۱۰ھ میں ہوا تھا اور سات سال کے بعد اُن کے پدرِ بزرگوار کا یعنی سنہ ۱۳۱۷ھ میں انتقال ہوا۔ ان سانحو کے بعد ہی یہ مسدس نظم کی گئی ہے کیونکہ کچھ بند اس نظم میں ایسے ہیں جو اس حقیقت کی جانب اشارہ کرتے ہیں۔ — سید زائر حسین کاظمی

اتحاد

وہ مواجِ قلزم وہ دریائے اعظم — کہ دونوں کنارے ہیں جس کے دو عالم
زباں زد ہیں جس کے فتوحاتِ پیہم — ہے اسلام ہی بس کریں غور اگر ہم
تشیع تسنن ہیں لہریں اسی کی
سمجھئے اسے آپ نہریں اسی کی

انھیں دونوں چشموں سے نکلے ہیں اکثر   وہ شعبے جو ہیں سب ملا کر بہتر
ہے ان دونوں صیغوں کا اسلام مصدر   ہیں در اصل یہ دونوں شاخیں برابر
کوئی تیغ ان میں ہے کوئی قلم ہے
نشاں ہے کوئی اور کوئی قلم ہے

خدا ایک ہے جانتے ہیں یہ دونوں   رسول اپنا پہچانتے ہیں یہ دونو
جو کچھ کعبہ ہے مانتے ہیں یہ دونو   اسے قبلہ گردانتے ہیں یہ دونو
عمل دونوں کا ہے کلام خدا پر
فدا دونوں ہیں عترت مصطفےٰ پر

اصولوں میں جب متحد ہیں یقینی   رہیں مل کے باہم سب اخوان دینی
عبث پھر فروعات پر نکتہ چینی   مقطے اسقطے بجا ہے بیشی بینی
چلیں گے یہ فرسودہ راہیں کہاں تک
پسِ پشت آخر نگاہیں کہاں تک

انھیں دونوں پیروں سے اسلام چل کر   ترقی کی دنیا کرے گا مسخر
اگر پاؤں الجھے لگے گی وہ ٹھوکر   کہ یہ سر کے بل آ رہے گا زمیں پر
پھر اس طرح مجبور و ناچار ہو گا
کہ دم ٹھنا اٹھائے سے دشوار ہو گا

درانداز یاں ہم میں ہیں جن کا پیشہ   لگاتے ہیں وہ پاؤں پر اپنے تیشہ
یوں ہی رخنے پڑتے رہیں گے ہمیشہ   تو کمزور ہو جائے گا ریشہ ریشہ
ہرا نخل اسلام کیوں کر رہے گا
کہو اک زمانہ ہمیں کیا کہے گا

محبت کا لائیں ثمر دو نو شاخیں　　ملیں جھک کے باہم دگر دو نو شاخیں
دکھائیں عروج شجر دو نو شاخیں　　پھلیں پھولیں المختصر دو نو شاخیں
شریفانہ اخلاق کے پھول مہکیں
عنادل سرِ شاخ مستانہ چہکیں

وہ جام محبت پلا آج ساقی　　کہ پیدا ہو کیف سلیم المذاقی
دلوں میں اثر کیوں رہے اس کا باقی　　کہ تھی اتفاقی یہ نا اتفاقی
فریقین مل کر کریں عذر خواہی
بھرے جسم اسلام کا زخم الٰہی

یہ زخم اور اسلام اسلام والو　　سنبھالو اب اس ناتواں کو سنبھالو
جو کچھ ہو چکا اس پہ تم خاک ڈالو　　بدن سے لہو کیوں زیادہ نکالو
رہو مل کے باہم ہنسو اور بولو
زبانوں کے نشتر فصدیں نہ کھولو

کہاں ہیں دلوں کے ملا دینے والے　　فصاحت کے دریا بہا دینے والے
محبت پہ لکچر سنا دینے والے　　رلا دینے والے ہنسا دینے والے
اٹھیں اٹھ کے از راہ اخلاص مندی
دلوں کی کریں آج شیرازہ بندی

مضر ہے مضر ہے ہوائے تخالف　　یہ شہر اور اس میں وبائے تخالف
تمدن پہ آفت نہ لائے تخالف　　مٹا دو مٹا دو بنائے تخالف
یہ کیا کر رہے ہو یہ کیا ہو رہا ہے
جہالت کی آخر کوئی انتہا ہے

وہ اخلاق کا ایک سرسبز پودہ ۔۔۔ لگایا ہوا خاتم الانبیاء کا
پھیلک کر جو روئے زمیں پر ہے چھایا ۔۔۔ جسے دین اسلام کہتی ہے دنیا
تم اس نخل کی حیف جڑ کاٹتے ہو
تعلق ہے جس کا وہ لڑ کاٹتے ہو

تعصب کو چھوڑو محبت جتاؤ ۔۔۔ کچھ اسلام کی اپنی قوت بڑھاؤ
کمی حسن اخلاق کی جن میں پاؤ ۔۔۔ ان افراد کو تم مہذّب بناؤ
جو آلودۂ زنگ پرزے رہے سب
چلے گی یہ قومی مشین آپ سے کب

یہ ہمدردِ اسلامیوں کو خبر دو ۔۔۔ کہ میدانِ ہمت کے اے رہ نوردو
تعصب سے اس قوم کو پاک کر دو ۔۔۔ محبت کی اسٹیم انجن میں بھر دو
یہی پرزے پھر کام دینے لگیں گے
فرائض کو انجام دینے لگیں گے

فریقین شیر و شکر جس طرح تھے ۔۔۔ ابھی کچھ دنوں بیشتر جس طرح تھے
ہم آہنگ باہم دگر جس طرح تھے ۔۔۔ شب و روز کرتے بسر جس طرح تھے
اسی طرح اب بھی رہیں مل کے باہم
وہ ماہِ صفر ہو کہ ماہِ محرم

رہیں سوچتے کیوں حریفانہ گھاتیں ۔۔۔ کریں نت نئی کیوں دل آزار باتیں
کٹیں کیوں مصیبت میں دن اور راتیں ۔۔۔ پولس لائے کیوں خیمے ڈیرے قناتیں
ہنسے گا بتاؤ یہ کس پر زمانہ
اگر مذہبی کام ہوں وحشیانہ

کچھ اسلام کی شان و شوکت بڑھاؤ		مجالس کو بے خار گلشن بناؤ
فریقین کو صحبتوں میں بلاؤ		طریقے تمدن کے سب کو دکھاؤ

نہ شیعہ ہوں سنی نہ سنی ہوں شیعہ
ترقیِ اسلام کے ہوں ذریعہ

ضرورت محبت کی ہے سخت ہم کو		یہی تاج ہم کو یہی تخت ہم کو
یہ دولت جو چھوڑے گی یکلخت ہم کو		کہے گی ہر اک قوم کم بخت ہم کو

صفی نام مٹ جائے گا دیکھ لینا
یہ اسلام مٹ جائے گا دیکھ لینا

نوٹ:- ۱۹۳۶ء میں لکھنؤ کی سرزمین پر ہونے والا شیعہ سنی فساد عالم گیر نوعیت حاصل کر چکا تھا۔ اس فساد سے اسلام کی رواداری ملیامیٹ ہو چکی تھی۔ اسلامی اتحاد کا شیرازہ بکھر چکا تھا۔ لسان القوم صفی لکھنوی جو اتحادِ مسلمین کے علمبردار تھے خاموش نہ بیٹھ سکے یہ مسدس نظم کر کے دونوں فرقوں میں تقسیم کرائی۔

سید نذار حسین کاظمی

دل گداز

خوب اس دنیا کی ہم نے سیر کی ۔ مدرسہ کی میکدہ کی دیر کی
فرطِ حیرت سے کچھ ایسے کھو گئے ۔ ہم جہاں پہنچے وہیں کے ہو گئے
جب کھلیں آنکھیں ہوئی شرمندگی ۔ چلتی پھرتی چھاؤں تھی یہ زندگی

یاد آیا ہے کہ ہم کو ہوش تھا ۔ ابتدا میں انتہا کا جوش تھا
اپنے سرچشمے سے ہم نزدیک تھے ۔ فیض یاب قوتِ تحریک تھے
نیت خالص ہمارے دل میں تھی ۔ چاشنی ایمان کی آب و گِل میں تھی
مرکزی قوت سے جب ہٹتے گئے ۔ جس قدر بڑھتے گئے گھٹتے گئے
جب بڑھے منبع سے تیرہ سو قدم ۔ کیا تھے اور کیا ہو گئے افسوس ہم
گھر گئے بڑھ کر عجب آفات میں ۔ پھنس گئے خاشاکِ تسویلات میں
پھیلے اتنا صورتِ سیلاب ہم ۔ رفتہ رفتہ ہو گئے پایاب ہم
گر یہی حالت رہی بے اشتباہ ۔ کچھ دنوں میں خشک ہو جائیں گے آہ
چھوڑ کر خطِ صراط المستقیم ۔ پڑ گئے چکر میں باللہ العظیم
صبر و استقلال کھو بیٹھے تمام ۔ آبرو سے ہاتھ دھو بیٹھے تمام

ہاں ٹھہر اے گردشِ دوراں ٹھہر ۔ دیکھ لینے دے پلٹ کر اک نظر
بحرِ ہستی اپنا دھارا پھیر دے ۔ سوئے مبدا رخ ہمارا پھیر دے
واقعوں کے اے محیطِ موج خیز ۔ بہہ ذرا سوئے نشیب اتنا نہ تیز
تھوڑی دیر آرام کر دم لے ذرا ۔ تھم کے بہہ لینا بہت جلدی ہے کیا

اے مری عمر رواں اے میری ناؤ — اس طرف کیوں جا جدھر کو ہے بہاؤ
ہاں نفس کے بادبانو اک ذرا — موڑ دو سینہ جہاز عمر کا
جلد اے تاریخ اپنی دوربیں — لاکے ہم کو دے کہ دیکھیں ہم نشیں
اپنے آثار قدیمہ تھوڑی دیر — دور اس دریائے بے پایاں کا پھیر

ہم وہی ہیں جھیلتے تھے سختیاں — تھی جب اولاد امیہ حکمراں
ہم وہی ہیں تھے بلا میں مبتلا — جب زمانہ تھا بنی عباس کا
تشنگی تھی داخل جرم کبیر — اس خطا پر روز ہوتے تھے اسیر
چین سے رہنے نہ پاتے تھے کہیں — ڈھونڈھتے پھرتے تھے ہم کو اہل کیں
کاٹے جاتے تھے ہمارے بند بند — ذبح یوں ہوتا تھا جیسے گوسفند
سیکڑوں ہی گھر جلا ڈالے گئے — زندہ ہم اکثر جلا ڈالے گئے
زندہ کیسے مردے جلوائے گئے — کھود کر قبریں نکلوائے گئے
ہوتے تھے تشہیر بازاروں میں ہم — جاتے تھے بندھ بندھ کے بازاروں میں ہم
گردنیں داغی گئیں اور ہاتھ بھی — کون سی توہین تھی جو اٹھ رہی
لوٹا جاتا تھا ہمارا مال و زر — پھرتے تھے بے دست و پا ہم دربدر
مسکنوں میں رہنے پائے کب غریب — موت غربت کی ہوئی اکثر نصیب
جب ہوئے داخل کسی تدبیر سے — مر کے نکلے خانۂ زنجیر سے
دفن کرنا تک ہمارا تھا گناہ — مر گئے بے دفن و کفن رہتے تھے آہ
رونے والے ہم کو رو سکتے نہ تھے — بچہ ہو منھ اشکوں سے دھو سکتے نہ تھے
رونے آتا جو اپنے حال پر — تازیانے پڑتے تھے اطفال پر
مشہدوں پر بھی نہ پاتے تھے اماں — بہتی تھیں ہر جا لہو کی ندیاں

گردنیں لاکھوں ہماری کٹ گئیں — ڈھیر سے لاشوں کے گلیاں پٹ گئیں
پتھروں میں ہم دبائے جاتے تھے — سولیوں پر ہم چڑھائے جاتے تھے
قتل ہوتے تھے کبھی ہوتے تھے قید — خون کے پیاسے تھے عمرو بکر و زید
جب کوئی قتل ستم آرا بنا — خون سے سادات کا گارا بنا
دل شکن الفاظ سنوائے گئے — زندہ دیواروں میں چنوائے گئے
کاٹ کر لائی گئیں نہریں کبھی — ہل چلے قبروں پہ اف ری بے بسی
جوش کیسا ماتم شبیر میں — رو نہ سکتے تھے غم شبیر میں
مقتداؤں پر ستم ہوتے رہے — ظلم سب پر بیش و کم ہوتے رہے
چین سے رہنے نہ پائے الحذر — گوشہ گیری میں ہوئیں عمریں بسر
اس پہ بھی ہوتے رہے اکثر اسیر — زہر دلواتی رہی قوم شریر
پردہ ہائے ساز زنگارنگ تھے — چھیڑ دے کوئی تو ہم آہنگ تھے
رہتے تھے باہم دگر شیر و شکر — کس مزے سے عمر ہوتی تھی بسر
تلخ اپنی زندگی ایسی نہ تھی — اب جو حالت ہے کبھی ایسی نہ تھی
قوم کے افراد میں تھا اتفاق — یوں نہ تھا باہم دگر بغض و نفاق
قوم کی جب عمر کا آئے خیال — ہر صدی کو فرض کیجیے ایک سال
اس طرح تخمین کر سمجھ لیجیے ذرا — اس بلاکش قوم کا کیا سن ہوا
چودھواں نام خدا گو سال ہے — صبح ہے تو شب نہیں یہ حال ہے
ننگ پیری ہے جوانی قوم کی — قصۂ پرغم کہانی قوم کی

قوم اے قوم اے مری مظلوم قوم — مردہ دل افسردہ دل مغموم قوم
جوش ہمت وہ ترا کیا ہو گیا — پاؤں کیوں راہِ سعی میں سو گیا

ہوگیا کیا وہ دماغ و دل ترا — حل ہو جو کیونکر عقدۂ مشکل ترا
یہ تو ظاہر ہے کہ ہے تجھ کو بقا — تا قیامِ قائم آلِ عبا
زندگی سے پھر تجھے کیوں یاس ہے — مرگ کا ہر وقت کیوں وسواس ہے
زندہ ہے لیکن بحالِ احتضار — زندہ قوموں میں نہیں تیرا شمار
دیکھ قومیں جو تری ہم عمر ہیں — بلکہ وہ تک جو تجھ سے کم عمر ہیں
نیز وہ جو تیری نسبت ہیں کم سن — کرتی جاتی ہیں ترقی رات دن
اور ایک تو ہے اطمینان سے — سو رہی ہے ہاتھ دھو کر جان سے
علم سے مطلب نہ حکمت سے غرض — نفس پر غالب جہالت کا مرض
قوم کی ہر فرد خود بیں خود ستا — جو تھا لنکا میں وہ باون گز کا تھا
گو نہیں تہذیبِ اخلاق اس قدر — ناز ہے قومی شرافت پر مگر
گو کہ اک جزوِ معطل ہیں ہمیں — پر زمانے بھر میں افضل ہیں ہمیں
صنعت و حرفت سے ہم کو ننگ و عار — باپ دادا تھے وزیر و شہریار
پیشہ ور مزدور کہلائیں یہ کیا — بازیوں سے دل نہ بہلائیں تو کیا
ہم کریں محنت یہ دل کو شاق ہے — فکر روزی کیا خدا رزاق ہے
لکھنا پڑھنا جس کو شد بُد آ گیا — وہ تو سمجھا کہ تفرد پا گیا
اس سے پڑھ کر کون ہے صاحب کمال — گل جسے از بر ہو بستانِ خیال
کچھ ہوئی پیدا تو یوں خوبی ہوئی — پستی اخلاق میں ڈوبی ہوئی
دیں جواب اس کا جو سمجھا دیں کہیں — تم کوئی قاضی نہیں مفتی نہیں
کون تم سمجھانے والے بار بار — ہم کو اپنے فعل کا ہے اختیار
تیرہ بختی کا ہماری ہے یہ حال — ایک بھی ہو میں نہیں روشن خیال

شرم شرم اے قوم یہ خوابِ گراں — اُٹھ رہی ہیں دیکھ تجھ پر انگلیاں
خواب وہ سکتہ سے بد تر ہے جو خواب — خواب وہ خوابِ اجل کا ہم رکاب
بے سبب کیا غل مچانے آئے ہیں — نیند سے تجھ کو جگانے آئے ہیں
عمر ہے غفلت میں ساری کھو رہی — کیا ہی میٹھی نیند ہے تو سو رہی
ہم نے یہ مانا جوانی کی ہے نیند — یا خمارِ سرگرانی کی ہے نیند
یا علی کہہ کر اگر اُٹھ بیٹھ قوم — تا کجا آخر یہ استیلائے نوم
ہے اگر ناساز کچھ تیرا مزاج — ہیں اطبا جمع - کران کا علاج
جب زمانہ اور تھا اب اور ہے — خسروِ برطانیہ کا دور ہے
اپنی اصلاحوں میں تو آزاد ہے — مہرباں تجھ پر شفیق استاد ہے
کچھ ترقی کے قدم آگے بڑھا — اپنی غفلت کو نہ جھنڈے پر چڑھا
جا سبق پڑھ مکتبِ اخلاق میں — بن ذرا پھر دل عزیز آفاق میں
دوست کو دشمن بنایا بھی تو کیا — لطف جب ہے دوست دشمن کو بنا
یاد کر خلقِ نبیؐ خلقِ علیؑ — سہتے تھے ظلمِ خفی ظلمِ جلی
کام لیتے تھے تحمل سے مگر — دفعِ شر ہر وقت تھا مدِ نظر
یہ سنا تو ہو گا لیکن پھر سنو — جو مرے گُڑ سے اسے کیوں زہر دو
دل ہے شیشہ بھر کے دیکھو تو ذرا — بادۂ دع ما کدر خذ ما صفا
اس سے بہتر کچھ نہیں آفاق میں — قوتِ اعجاز ہے اخلاق میں
نفس کو اخلاق سے کامل کرو — دین و دنیا دونوں پھر حاصل کرو
دین کی پابندیوں کے ساتھ ساتھ — ہاتھ میں لو دولتِ دنیا کا ہاتھ
اتفاقِ باہمی پیدا کرو — قوم میں کیوں برہمی پیدا کرو
شہرتِ ذاتی کا چھوڑو وسوسہ — مل کے کھولو ایک قومی مدرسہ

صنعت و حرفت کا وہ اسکول ہو | انتظام اس کا مگر معقول ہو

بورڈنگ ہوس آپ جس کو کہہ سکیں | طالب العلم آ کے اکثر رہ سکیں

جو بنائی جائے تعلیمی نصاب | ہوشیاری سے ہو اس کا انتخاب

جامع و نافع وہ درسیات ہوں | دُنیوی و دینی ضروریات ہوں

مجھ کو جب پیدا ہوا تھا یہ خیال | کم سے کم اس کو ہوئے بائیس سال

نخل فریاد اک پرانی مثنوی | دیکھ لیجیے ہے اسی مضمون کی

صنعت و حرفت ہو جس کا ماحصل | کون اس تحریک پر کرتا عمل

سن کے دردانگیز فریاد صفی | قوم نے افسوس کروٹ تک نہ لی

خواب غفلت میں پڑی سوتی رہی | عہدِ نکبت میں پڑی سوتی رہی

قیمتی وقت اس قدر ضائع کیا | ساتھ اس کے مال و زر ضائع کیا

بعد مدت خواب سے چونکی تو ہے | دیکھیے کرتی ہے کیا اب قوم طے

کرتی ہے عرض ندامت یا نہیں | ہوتی ہے سرگرم محنت یا نہیں

دے الٰہی قوم کو توفیقِ نیک | بہرہ ور علم و عمل سے ہو ہر ایک

مبتلائے جہل ساری قوم ہے | واہ کیا ہم کیا ہماری قوم ہے

ہو نہ جائے فرطِ عشرت سے ہلاک | قوم کی حالت بہت ہے خطرناک

قوم کو کہتا تو ہوں خود کیا ہوں میں | قوم کے دامن کا اک دھبا ہوں میں

قوم میں مجھ سا نہ ہوگا ننگ قوم | قوم آئینہ مری میں زنگ قوم

مجھ سا کب ہوگا کوئی بدنام قوم | گردِ روئے قوم و دُردِ جامِ قوم

اب کہاں تک قوم کا دکھڑا صفی | ختم بھی ہوگی کبھی یہ مثنوی

جمع ہیں دیکھو جواں مردانِ قوم　　مصلحانِ قوم و ہمدردانِ قوم
قوم کی اصلاح ہو یہ فکر ہے　　رات دن باہم اسی کا ذکر ہے
منزلیں طے کرکے آئے ہیں یہاں　　تین دن سے ہیں تمہارے میہماں
خدمتِ قومی سمجھتے ہیں جو فرض　　ان کی خدمت میں کرو اس طرح عرض

اے معزز میہمانو محسنو　　قوم کے راحت رسانو محسنو
ہم ادا کرتے ہیں سب کا شکریہ　　ہے زبان و دل سراپا شکریہ
آپ آئے محفل آرائی ہوئی　　لکھنؤ کی عزت افزائی ہوئی
ہیں معالج آپ جس کے واقعی　　ہیں اسی بیمار کے ہم خدمتی
مشترک تشویش میں تھے مبتلا　　میہمان و میزبان صبح و مسا
کیا کہیں کچھ بھی نہ خاطر کر سکے　　دل کی حالت کو نہ ظاہر کر سکے
آپ کے بیمار کے تیماردار　　عفو تقصیرات کے ہیں خواستگار
بندہ پرور آپ کو آنا نصیب　　سالِ آئندہ ہمیں لانا نصیب

فی امان اللہ اے ارکانِ قوم
فخرِ قوم اے تاجِ قوم اے جانِ قوم

نوٹ:- یہ نظم بھی آل انڈیا شیعہ کانفرنس کے اجلاس دوم منعقدہ ۱۹۰۸ء میں پڑھی گئی تھی جس میں فرقۂ شیعہ کی مختصر تاریخ اور قومی عروج و زوال کا ذکر کیا گیا ہے اور تعلیم کے ذریعہ ترقی کرنے اور درسگاہ کھولنے کی تحریک پیش کی گئی ہے۔

سید زائر حسین کاظمی

نالۂ مستانہ

اے قوم مبارک ہو یہ جلسۂ سالانہ
کچھ اہلِ دل آئے ہیں سننے ترا افسانہ
ہے میکدۂ عشرت ہر گوشۂ کاشانہ
پھر جمع ہیں متوالے گردش میں ہے پیمانہ
ہاں اے دلِ شوریدہ اک نالۂ مستانہ

اے قوم ترقی کے تیرے جو ہیں شیدائی
کیوں کر نہ پھریں ہر سو وہ صورتِ سودائی
اے قوم کے اقبال اے ان آنکھوں کی بینائی
اس شوق میں آئے ہیں مدت کے تمنائی
شاید نظر آجائے پھر جلوۂ جانانہ

نقارۂ گردوں تک بجتی تھی تری نوبت
اسلام کی خوبی کو تھی تجھ سے خصوصیت
وہ حوصلہ وہ ہمت وہ دبدبہ وہ صولت
آخر ہوئی کیا اے قوم اگلی وہ تری حالت
وہ شانِ ملوکانہ وہ شوکتِ شاہانہ

جاہ و حشم و دولت اس قوم کا حصہ تھا
علم و عمل و حکمت اس قوم کا حصہ تھا
آسودگیٔ حالت اس قوم کا حصہ تھا
پاکیزگیٔ سیرت اس قوم کا حصہ تھا
ہر قول فقیہانہ ہر فعل حکیمانہ

جب سے کہ ستارہ ہے اس قوم کا پستی میں
جو نام کیا پیدا وہ نفس پرستی میں
یکساں رہی کیفیت ہشیاری و مستی میں
پامالِ خزاں کب تک اس گلشنِ ہستی میں
کچھ رنگ جما اپنا او سبزۂ بیگانہ

اک وقت میں جو کی تھیں اسلاف نے تدبیریں
اخلاف نے سب توڑیں مضبوط وہ زنجیریں
برباد ہوئیں کیا کیا اوقاف کی جاگیریں
صد حسرت کہ وہ اجڑی ہوئی تعمیریں
پہلے تھی جہاں بستی اب ہے وہاں ویرانہ

جس قوم کا حصہ ہو خود بینی و خود رائی — محسوس اُسے کیا ہو کمزوریِ بینائی
اس طرز تمدن پر ہنستے ہیں تماشائی — تقاضائے حماقت ہے یہ دعویِ دانائی

نادان سے ناداں ہے فرزانے فرزانہ

افراد کو گھیرے ہیں امراض جو نفسانی — گھٹتی ہی چلی جاتی ہے قوت ایمانی
اے قوم علاج اس کا ممکن ہے بآسانی — اسلام میں خود تیرے موجود ہیں لاثانی

اخلاق کا اک مہتم بالشان شفاخانہ

اے قوم کے نوخیزو راہیں نہ چلو بے جا — برباد ہوں کیوں نسلیں کیوں تم پہ ہنسے دنیا
چوسی ہوئی ہڈی کو کیوں چوس کے ہو رسوا — کچھ نام کرو پیدا کچھ کام کرو یہ کیا

گلیوں میں پڑے پھرنا مثل سگ دیوانہ

کھیلوں میں تماشوں میں عمر اپنی گنواتے ہو — پاتے ہو اگر تم دو تو بیس اڑاتے ہو
میلوں کے لیے عمدہ پوشاک بناتے ہو — جب پاس نہیں ہوتا تب قرض منگاتے ہو

برتے پہ مہاجن کے یہ ٹھاٹھ امیرانہ

کیوں صرف خباثت ہے جو ذہن میں ہے تیزی — محسوب ہنرمندی ہر مفسدہ انگیزی
اخلاق نہ اسلامی اپنے ہیں نہ انگریزی — ہے رشتۂ مذہب سے صرف اتنی دل آویزی

کھانے کو قسم ہے پاس اک سبحہ صد دانہ

اعلیٰ ہو کہ ادنیٰ ہو ہم سب سے اکڑتے ہیں — جتنا کوئی سمجھائے اتنا ہی بگڑتے ہیں
سیدھی جو کریں باتیں معلوم ہو لڑتے ہیں — جو کام کریں باہم لڑتے ہیں جھگڑتے ہیں

ہیں انجمنیں اپنی بازیچۂ طفلانہ

کچھ قرض اگر لے لیں پھر دیں نہ قیامت تک — انکار کریں نوبت پہنچے جو عدالت تک
تائید میں دینے کو تیار شہادت تک — قانون نہیں از بر میعاد سماعت تک

اور اس کو سمجھتے ہیں اک چال حریفانہ

تلبیس و دغابازی مکاری و غداری — اغوا و فسوں سازی طراری و عیاری
کیادی و غمازی عیاشی و میخواری — کذب و غلط اندازی اوباشی و خونخواری
یہ جملہ رذائل ہیں فہرست صلح نامہ

محنت سے مشقت سے نفرت ہمیں ہے نفرت — حاصل ہے ید طولیٰ چوری میں جوئے کی لت
ان سب سے بچے شاید تو بھیک کی ہے عادت — شیطان مجسم ہیں لاحول ولا قوت
دھوکے کی ہے اک ٹٹی ملبوس شریفانہ

شیوہ جو ہمارا ہے بغض و حسد و کینہ — کچھ کام نہیں دیتی اب الفت دیرینہ
کیا تاب کہ دورت سے رکھیں جو دل آئینہ — ہر وقت نفاق آگیں ہر شخص کا ہے سینہ
دو روز بھی آپس میں نبھتا نہیں یارانہ

ناخواندہ پہونچتے ہیں بو پا کے ضیافت کی — پھر اس پہ رجز خوانی اظہار شرافت کی
عادت ہی نہیں رکھتے ہم صبر و قناعت کی — افلاس کی شدت سے یہ حد ہے وقاحت کی
سنتے ہیں جہاں دعوت گھس پڑتے ہیں درانہ

حق خمس و زکواۃ اپنا زردار سمجھتے ہیں — روزوں کو نمازوں کو بیکار سمجھتے ہیں
مفلس جو مرے شرکت ہم عار سمجھتے ہیں — میت کا اٹھانا تک اک بار سمجھتے ہیں
ڈر ہے کہ جو دیں کاندھا گھسنے نہ لگے شانہ

ناعاقبت اندیشی ہر بات میں رہتی ہے — اس وجہ سے بدنظمی اوقات میں رہتی ہے
جان اپنی دنائت سے آفات میں رہتی ہے — مقصود ریاکاری خیرات میں رہتی ہے
چار آدمی جب دیکھیں تب صرف ہو اک آنہ

ہر صنعت و حرفت سے ہم ہاتھ اٹھا بیٹھے — ہر علم سے حکمت سے ہم ہاتھ اٹھا بیٹھے
اسباب معیشت سے ہم ہاتھ اٹھا بیٹھے — احکام شریعت سے ہم ہاتھ اٹھا بیٹھے
ہے گرم فقط ہم سے اب محفل رندانہ

اس وقت نہ پہنچیں گے جس وقت بلادت کیجیے | سن لیجیے سو باتیں اک وعظ سنا دت کیجیے
رنج بھی نہ کرے کوئی مسجد جو بنا دت کیجیے | ہاں جا کے تھیٹر میں اک شمع جلا دت کیجیے

پھر دیکھیے گرتا ہے پروانہ پہ پروانہ

اے لکھنؤ اے مرکز ہم اہل تشیع کے | کیا ہو گئے تجھ سے بتلا تو ارباب ہمم تیرے
زندہ ہیں ترے مردے مردہ ہیں ترے زندے | اے کاش کوئی دیکھے عبرت کی نگاہوں سے

وہ قبلہ و کعبہ کا مشہور عزا خانہ

گرتی ہوئی دیواریں ہیں قوم سے فریادی | ڈھتی ہوئی محرابیں ہیں مائل بربادی
یہ مقبرہ اس کا ہے جو قوم کا تھا ہادی | جنبش میں ذرا آ جائے قوت امدادی

ہستی کا عمارت کی لبریز ہے پیمانہ

تیری رگ غیرت میں گر کچھ بھی حرارت ہے | اے قوم دل افسردہ فرض اس کی مرمت ہے
جو ہند کے خطے میں اک تختۂ جنت ہے | حیف اس کی مرمت کو چندہ کی ضرورت ہے

چندہ نہ کہوں اس کو ہے خلد کا بیعانہ

بس قوت ہمدردی دل میں نہ اٹھا محشر | ہیں جمع یہاں ماشاء اللہ کرم گستر
فصد رگ غیرت کو درکار نہیں نشتر | ہاں جوش میں اب آ جا یہ نظم صفی سن کر

اے خون جواں مردی دے ہمت مردانہ

نوٹ:۔ آل انڈیا شیعہ کانفرنس کے سالانہ اجلاس کے موقع پر جو ۲۴، ۲۵ اور ۲۶ دسمبر ۱۹۰۰ء کو ہوا تھا یہ نظم صفی لکھنوی نے پڑھی تھی۔ اس نظم میں قوم کی جانب توجہ دلائی گئی ہے کہ قوم کے افراد قومی معاملات میں حصہ لیا کریں۔ اس وقت کی کیفیت یہ تھی کہ عیش و عشرت، ناچ رنگ، سیر و تماشے پر اپنی گاڑھی کمائی کا پیسہ صرف کرنے میں قوم کے افراد فخر و مباہات سمجھتے تھے۔ قوم کی بدحالی پر کوئی نظر نہ تھی۔ قومی ادارے سسکیاں لے رہے تھے۔ صفی لکھنوی نے ان برائیوں کو ہر اجتماع میں طشت از بام کیا اور ان برائیوں سے دور رہنے کی التجا کی۔

سید زائر حسین کاظمی

ترنجِ آہنگ

خبر ہے کچھ تجھے اے باغباں گلشن پہ کیا گزری
سرِ سنبل پہ کیا گزری کفِ سوسن پہ کیا گزری

ذرا ہم بھی سنیں اے رہروانِ جادۂ ہمت
سلوکِ وادیٔ پرخار سے دامن پہ کیا گزری

وفا سے اک حصارِ عافیت تم نے جو کھینچا تھا
جفا کے ہاتھ سے اس قلعۂ آہن پہ کیا گزری

لگا کے کس نے کیا کیا بدنما الزام کے دھبے
عزیزو اک سرِ کنعاں کے پیراہن پہ کیا گزری

دلِ روشن کہاں جھونکے کہاں بادِ مخالف کے
خبر لینا چراغِ وادیٔ ایمن پہ کیا گزری

تجھے آنکھیں خدا نے دی ہیں دیکھ اے قومِ خوابیدہ
ستم ہے خوشہ چینوں کے ترے خرمن پہ کیا گزری

لہو تیرا زمیں پر گر کے آخر رنگ کیا لایا
شکارِ نیم کشتہ تیرے صید افگن پہ کیا گزری

نہ آیا جب دلِ غیرت زدہ ناصح کی چالوں میں
لباسِ رہبری پہنے ہوئے رہزن پہ کیا گزری

بیاں کرتے ہوئے اس کو ہمیں تو شرم آتی ہے
تمھیں اے دوستو پوچھو دلِ دشمن پہ کیا گزری

ترا دل چاہتا ہے یا ستمگر میرا دل اس کو
تری ٹھوکر پہ کیا گزری مرے مدفن پہ کیا گزری

کہے رکھتا ہوں یہ رفتار دیکھ اچھی نہیں ظالم
چلا ہے شیشۂ دل توڑ کر چیں بر جبیں ظالم

اگر چھیڑو تو یوں چھیڑو کہ رسوائے جہاں کیوں ہو
سرِ محفل کوئی دل ٹوٹ کر سازِ فغاں کیوں ہو

تمھاری کار فرمائی ہی دلیلِ بدگمانی ہے
اگر ہو اعتمادِ دوستی تو امتحاں کیوں ہو

خدا محفوظ رکھے کیوں مرے ہمدرد بنتے ہو
تمھیں اے دوستو یہ غم نصیبِ دشمناں کیوں ہو

برا کہتے ہو یارو اپنے ہی منھ سے ہم زبانوں کو
خود اصلاحِ زباں کے مدعی پھر بدزباں کیوں ہو

جدا کرتے ہو اپنی قوم کا سر ہاتھ سے اپنے
پھر اس پہ یہ قیامت ہے کہ کوئی نوحہ خواں کیوں ہو

یہ مانا عالموں سے منحرف کل قوم ہو جائے
مگر یہ تو بتاؤ اس قدر تم بدگماں کیوں ہو

خود اپنے عالمانِ دیں سے یہ سوئے ادب توبہ
تم اتنے بادۂ نخوت سے آخر سرگراں کیوں ہو

جب اپنے ہاتھ سے بِس بوئے ہو قوم کے حق میں — تو پھر قاتل نہ تم ٹھہرے مسیحائے زماں کیوں ہو
کرو دنیا کو حاصل دائرہ میں شرع کے رہ کر — کہ اس دنیا کے پیچھے دولتِ دیں رائگاں کیوں ہو
خدارا یہ لباسِ دوستی میں دشمنی کیسی — تمہیں نامہرباں ہو جب تو کوئی مہرباں کیوں ہو

مری بیمار قوم آنکھیں یہ دیکھوں کیا دکھاتی ہیں
کہ تیری قوتیں تجھ کو جواب اب دیتی جاتی ہیں

گزشتہ سال کا بحران بھولا ہوں نہ بھولوں گا — طبیعت کا تری ہیجان بھولا ہوں نہ بھولوں گا
مرے بیمار جو جو آئے تھے تیری عیادت کو — کبھی ان سب کا میں احسان بھولا ہوں نہ بھولوں گا
ہوئے تھے جو فروکش آ کے منزل گاہ میں تیری — ہیں اب تک یاد وہ مہمان بھولا ہوں نہ بھولوں گا
بنایا تھا شفاخانہ ترے تیمارداروں نے — وہ اس کا ساز وہ سامان بھولا ہوں نہ بھولوں گا
جہاں ہوتا تھا باہم مشورہ تیرے مداوا کا — عظیم الشان وہ ایوان بھولا ہوں نہ بھولوں گا
ڈبونے جو اٹھا تھا قوم کا منجدھار میں بیڑا — وہ ناصح تھا کہ اک طوفان بھولا ہوں نہ بھولوں گا
دکھایا جس ادا سے جوشِ بے ہنگام ناصح نے — میں اس انداز کے قربان بھولا ہوں نہ بھولوں گا
حضورِ ناصحِ مغرور تھا منہ کھولنا مشکل — بنا تھا خلق کا دربان بھولا ہوں نہ بھولوں گا
وہ تقریریں تری وہ مفسدہ انگیز تحریریں — وہ ہر تحریک کا عنوان بھولا ہوں نہ بھولوں گا
مریضانِ محبت سے کسی کے بے رخی تیری — بتِ خاطر خدا کی شان بھولا ہوں نہ بھولوں گا

بُرائی کو بھلا سمجھے بھلائی کو بُرا سمجھے
جو ایسا ناسمجھ ہو ایسے ناصح سے خدا سمجھے

ملالِ حسرتِ خاطر رنج کیوں کر دل سے نکلے گا — صفی نکلے گا یہ کانٹا مگر مشکل سے نکلے گا
توقع یہ نہ تھی ہرگز کہ حسرت دل شکن ایسا — لبِ کلکِ جنابِ ناصحِ فاضل سے نکلے گا
یہ مانا منطقی بھی فلسفی بھی آپ سب کچھ ہیں — نتیجہ کون سا اس بحثِ لاطائل سے نکلے گا
جو فقرہ سخت نکلا ناصحِ ذی علم کے منہ سے — نہ ہرگز وہ زبانِ مردمِ جاہل سے نکلے گا

خدا حافظ ہے تیرا اگر یہی نازک مزاجی ہے
جہاں جائے گا تو ناصح اسی محفل سے نکلے گا

یہی انداز گر ہے سخت گیری کا تری قاتل
سمٹ کر خون سارا شہ رگِ بسمل سے نکلے گا

نگاہِ واپسیں ڈالی جو خوں گرم محبت نے
بجائے نالہ اک شعلہ دلِ قاتل سے نکلے گا

عقائد میں ہے جتنا نقص لے بیعت کسی پیر سے
وہ فیضِ اجتہادِ مرشدِ کامل سے نکلے گا

نہ چھوڑ اے قوم دامن حاکمانِ شرع کا اپنے
دُرِ مقصود اسی دریائے بے ساحل سے نکلے گا

ذرا ہشیار غافل ایک دن وہ آنے والا ہے
نفس کا کارواں جب سرحدِ منزل سے نکلے گا

رہیں گے ہم نہ تیری ذات رہ جائے گی دنیا میں
زبانوں پر فقط اک بات رہ جائے گی دنیا میں

برنگِ خار جب نشتر زباں اس باغ کے گل ہیں
ترقی پر سمجھ اے قوم آثارِ تنزل ہیں

یہ سب کیا ہے فقط کمزوریِ اخلاقِ سنجیدہ
ترے افراد جس میں مبتلا از جزو تا کل ہیں

یہ سب کیا ہے فقط ناداریِ اسبابِ ہمدردی
کہ باہم تشنۂ خون بیدریغ و بے تامل ہیں

یہ سب کیا ہے فقط ناشکریِ انعامِ ربانی
کہ ہنگامِ امورِ خیر پابندِ تساہل ہیں

یہ سب کیا ہے فقط خمیازۂ پندارِ لا یعنی
کہ اس بزمِ جہاں میں قائلِ دور و تسلسل ہیں

یہ سب کیا ہے فقط افسردگی خونِ محبت کی
کہ اپنے اقربا سے دست بردارِ تکفل ہیں

نہ پوچھ اے قوم اپنے منچلوں کا حال اب ہم سے
شہیدِ تیغِ ابرو ہیں اسیرِ دامِ کاکل ہیں

صدائے نعرۂ اللہ اکبر کون سنتا ہے
خراباتِ جہاں میں گوش بر آوازِ قلقل ہیں

جو منھ سے پھول جھڑتے ہیں وہ سب بے رنگ و بو لیکن
چٹک اٹھیں جہاں تو سب یہی سمجھیں کہ بلبل ہیں

نہ پاسِ آبرو اُن کو نہ لطفِ گفتگو ہم کو
ہم اُن باتوں سے درگزرے کہ جن میں جھوٹ کے پل ہیں

خداوندا ہوئی اب کیا وہ راہ و رسمِ دیرینہ
یہی دل تھا جمالِ شاہدِ عصمت کا آئینہ

نوٹ:۔ آل انڈیا شیعہ کانفرنس کا اجلاس دوم ۲۴، ۲۵، ۲۶ دسمبر ۱۹۰۸ء کو لکھنؤ میں زیر صدارت مولانا سید نجم الحسن صاحب قبلہ مجتہد ہوا تھا۔ اس جلسہ میں نواب محمد حامد علی خاں آف رام پور راجہ ابو جعفر تعلقدار فیض آباد، چودھری ارشاد حسین تعلقدار ردولی، شاہزادہ جعفر علی خاں نبیرۂ امجد علی شاہ، شاہزادہ غلام محمد آف میسور، سید عابد حسین بیرسٹر وغیرہم نے شرکت کی تھی۔

اس سے قبل ۱۹۰۷ء کے اجلاس میں ایک ناگوار واقعہ پیش آیا تھا۔ وہ یہ کہ ڈاکٹر مرزا محمد ہادی نے ایک تجویز پیش کی جس کا مفہوم یہ تھا کہ مذہبی عامیانہ مناظرہ اور اشتعال آمیز تحریروں سے اس کانفرنس کو کوئی تعلق نہیں۔ اس تجویز کی بحث کے دوران کچھ ایسے امور پیش آئے کہ طوالت اور پیچیدگی بڑھتی گئی۔ اور خواجہ غلام الثقلین مرحوم کانفرنس سے علاحدہ ہو گئے۔ اس کے بعد علما اور تعلیم یافتہ حضرات میں کچھ اختلاف پیدا ہو گیا اور اس کا سلسلہ سال بھر اخباروں میں چلتا رہا۔ اس کو فرو کرنے کے لیے دوسرے سال اجلاس میں صفی لکھنوی نے یہ نظم پڑھی۔

۱۹۰۸ء کے اجلاس میں پڑھی گئی تمام نظموں کو "جواہر مہرہ" کے نام سے گلشن فیض مولوی گنج لکھنؤ سے زیر اہتمام واجد حسین عرف گلشن چھپوا کر اجلاس میں تقسیم کیا گیا تھا۔ اس کے ناشر سید عابد حسین کاشف تھے۔ اس کا بھی ایک نسخہ مرتب کے پاس محفوظ ہے۔

سید زائر حسین کاظمی

معذرت نامہ

ہمارے اجڑے ہوئے لکھنؤ کے مہمانو! شکستہ قصرِ تشیع کے محکم ارکانو!
بھنور سے ڈوبتی کشتی نکالنے والو! جہازِ قوم کا بیڑا سنبھالنے والو!
وقارِ کانفرنس اعتبارِ کانفرنس بہارِ کانفرنس افتخارِ کانفرنس
دیارِ ہند کے قومی مسافر و شیعو! ولائے آلِ محمدؐ کے ناصر و شیعو!
خمِ غدیر کے روشن ضمیر متوالو! ذرا ادھر بھی مرے دستگیر متوالو!
تم آؤ گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے یہ اور کچھ بھی نہیں جذبۂ محبت ہے
جگہ جہاں یہ ہے دل میں دکھا نہیں سکتے تمہارے قدموں سے اب سر اٹھا نہیں سکتے
دلوں میں آکے نئی روح پھونک دی تم نے جلا لیا کہ بھی روح پھونک دی تم نے
اٹھائی تین برس تم نے کیسی حیرانی جو چاہیے تھی وہ ہم کر سکے نہ مہمانی
دل آئینہ ہے مگر اور صاف کر دینا خطا ہوئی ہو جو کوئی معاف کر دینا
ابھی کچھ اور سنے جاؤ ہم کو کہنے دو ہمارے دکھتے ہوئے دل پہ ہاتھ رہنے دو
وفائے وعدہ ہے دشوار وعدہ آسان ہے کیا ہے جرم اگر بخش دو تو احسان ہے
قصوروار ہیں دل کو ملال ہو کہ نہ ہو ہمیں خیال ہے تم کو خیال ہو کہ نہ ہو
علاج کر نہ سکے اپنے دل کے داغوں کا دکھائیں خاک تماشا تمہیں چراغوں کا
ہمارے جلسۂ قومی کا تھا وہ پہلا سال کہ اس طرف توجہ ہوا تھا سب کا خیال
جنابِ قبلہ و کعبہ کا تعزیہ خانہ قیامت آئی بنا چاہتا ہے ویرانہ
اجل نے کی ہے جہاں ہر طرف چمن بندی چمک رہی ہے مزاروں پہ اک نشاں بندی
نہ جاؤ دور یہیں علم کے دفینے ہیں سپردِ خاک عجب قیمتی نگینے ہیں
یہی ہے منزلِ روشن فلک وقاروں کی فرودگاہ چمکتے ہوئے ستاروں کی

پڑے ہیں پھول وہ بکھرے زمیں کے دامن پر　　دکھا رہا ہے یہ طبقہ بہشت کا منظر
اسی بہشت کے قصروں کا حال ابتر ہے　　پڑے ہوئے ہیں وہ درخنے کہ عقل ششدر ہے
اگرچہ ایک نظر دیکھ لیجیے دو کار　　شکستِ دل کی خبر دیں گے خود در و دیوار
ستونِ خم کا اشارہ ہے یہ خوش اٹھا لو!　　سنبھالنا کہ چلا میں سنبھالنے والو

ہمارا ہند میں ہاں وادیِ السلام ہے یہ　　مقدس اور متبرک عجب مقام ہے یہ
مٹا جو نقش تو آئے گا قوم پر دھبا　　یہ حال سن کے نہ کیوں اہلِ دل کو جوش آجاتا
ہوئی یہ انجمن جعفریہ کی تحریک　　کہ اس چمن کی درستی میں ہے وہ دل سے شریک
یہ لکھنؤ نے مگر طے کیا کہ حسبِ رواج　　ہم اپنے زخمِ جگر کا کریں گے آپ علاج
ہمیں کریں گے مرمت امام باڑے کی　　ہمیں پہ فرض ہے خدمت امام باڑے کی
چنانچہ فکر یہی تھی اسی کی تھی تدبیر　　کہ ناگہاں ہوئی ظاہر نحوستِ تقدیر
وہ پیش آتے رہے واقعات جانفرسا　　کہ ہم کو ہائے کسی بات کا نہ ہوش رہا
گذر گئی جو گذرنی تھی نیم جانوں پر　　یہ شعر حضرت آتش کا تھا زبانوں پر

"چلی ہے ایسی زمانہ میں کچھ ہوا الٹی"
"کہ سیدھی بات سمجھتے ہیں آشنا الٹی"

غریقِ لجۂ غم الغرض ابھر نہ سکے　　ہزار حیف کہ ایفائے عہد کر نہ سکے
نجات پائی ہے غم سے خدا خدا کر کے　　کریں گے زخموں کا اپنے علاج جی بھر کے
صفی کیا ہے جو میں نے حوالۂ خامہ　　یہ لکھنؤ کی طرف سے ہے معذرت نامہ
وہ لکھنؤ کہ جو ہے تین سال سے محزوں　　کہوں محبتِ قومی کا جوش ہے کہ جنوں
یہ تین دن سے فلک پر گھٹا ہے چھائی ہوئی　　کہ لکھنؤ تری آنکھیں ہیں ڈبڈبائی ہوئی
یہ کیا یہ کیا ترا چہرہ یہ کیوں بحال نہیں　　تجھے کچھ اپنے مسافر کا بھی خیال نہیں

خوشی سے یہ بھی تو کہہ دے جدھر لڑی ہے نگاہ
خدا کو سونپ دیا جاؤ فی امان اللہ

نوٹ:۔ ۲۷ لغایت ۲۹ دسمبر ۱۹۰۹ء آل انڈیا شیعہ کانفرنس کا سالانہ جلسہ رفاہِ عام کلب لکھنؤ میں منعقد ہوا تھا۔ اس جلسہ کے صدر مولانا سید نجم الحسن صاحب قبلہ مجتہد اور سکریٹری سید علی غضنفر صاحب تھے۔ یہ نظم اسی جلسہ کے اختتام پر صفیؔ لکھنوی نے پڑھی تھی۔ یہ نظم چھپوا کر جلسے میں تقسیم بھی کی گئی تھی جس کی قیمت ایک آنہ تھی۔ نظم کے آخر میں سید منظور علی وصی ابن سید علی نقی صفیؔ لکھنوی کی یہ "گذارش" بھی چھپی تھی۔

"نالۂ مستانہ کی طرح یہ نظم بھی امام باڑہ غفران مآب کی شکستہ حالی کا فوٹو ہے۔ مصنف برکاتہ نے اپنی گراں بہا ہر دل عزیز نظم "لختِ جگر" کی کل قیمت مرمتِ امام باڑۂ مذکور کے لیے نذرِ کانفرنس کردی ہے۔ آخری اجلاس میں ادھر مصنف کی زبان پر یہ شعر تھا۔ ؎

لختِ بردازِ دل گزرد ہر کہ ز پیشم
من قماش فروشِ دلِ صد پارۂ خویشم

اُدھر روپئے روپئے کاپی بک رہی تھی۔ جتنی کاپیاں اُس وقت مل سکیں ہاتھوں ہاتھ خرید لی گئیں۔ بعض قدرشناسوں نے المضاعف قیمت بھی دی۔ ظاہر بیں نگاہوں میں ممکن ہے کہ یہ رقم زیادہ معلوم ہو مگر باعتبارِ اہمیت مقصود بہت ہی کم ہے۔ معقول صلہ اس قابل قدر نظم کا یہی ہوسکتا ہے کہ امام باڑہ ریپیرنگ فنڈ کے لیے کافی سرمایہ بذریعہ خریداری "لختِ جگر" قوم مہیا کردے۔ چونکہ یہ تحریک کسی ضعفِ ذاتی پر مبنی نہیں بلکہ اُن اسیرانِ خاک کی وکالت ہے کہ جن کی دردناک آوازیں نہ قوم سُن سکتی ہے نہ اُس سے سُنی جائیں گی۔ لہٰذا قوی امید ہے کہ خریدارانِ "لختِ جگر" اس کی خریداری کی طرف جو ایک قومی فرض ہے دیگر حضرات کو بھی متوجہ فرمائیں گے۔ جتنی کاپیاں مطلوب ہوں مصنف مدظلہ سے مل سکتی ہیں۔ چھ سو کاپیاں فروخت ہوجانے کے بعد ایک مکمل فہرست اس کے خریدارانِ "لختِ جگر" بتصریحِ قیمت منجانب امام باڑہ ریپیرنگ فنڈ انشاء اللہ طبع ہوکر شائع ہوگی۔"

یہ نظم مطبع گلشن فیض سے زیر اہتمام واجد حسین عرف کلن چھپی تھی۔

سید زائر حسین کاظمی

بسنت مالنی

ساقی تجھے بسنت کی بھی کچھ خبر نہیں
محنت کشوں کی زردیٔ رخ پر نظر نہیں

میکش ہیں آفتاب لب بام ساقیا
للّٰہ اس طرف بھی کوئی جام ساقیا

ے جام زرنگار کو گردش ترے نثار
سرسوں جما رہی ہے ہتھیلی پہ جان زار

تیرے مریض غم یرقان میں ہیں مبتلا
پکھراج کے کھرل میں ذرا حل تو کر طلا

معجون کہربا مئے گلنار چاہیے
ہاں بدرقہ میں شربت دینار چاہیے

جام عقیق زرد کو لبریز کر کے دے
کیا دے رہا ہے دیکھ ذرا اور بھر کے دے

بیجا یہ امتیاز ہے اپنے میں غیر میں
خست تجھے پسند نہیں کار خیر میں

تو وید بھی طبیب بھی پھر کیا ہے ساقیا
بدلی جو رت مزاج اب اچھا ہے ساقیا

نسخہ یہ دو ہی جز کا مگر ہے بڑا مفید
مل کر اس بسنت میں ہم تم منائیں عید

سرگرم سیر ہنستے ہوئے پیر و نوجواں
سرسوں کے کھیت دیکھنے میں کشت زعفراں

قدرت کے جو اصول ہیں زریں اصول ہیں
کیا زرد زرد دیکھیے گیندے کے پھول ہیں

مست شباب اوڑھے ہوئے کیسری ردا
گیندوں کے ہار گوندھ رہے ہیں بصد ادا

ہر سمت دور دور زرافشانیوں کی دھوم
شاہی سفید بارہ دری میں بڑا ہجوم

جلسہ یہ ہے کہ انجمن انجم و قمر
سر جیمس مسٹن اوج صدارت پہ جلوہ گر

وہ صوبہ جات متحدہ کے وزیر خاص
ہے جن کے دل کو خلق و مروت سے اختصاص

عاجز نواز فیض رساں تکیہ گاہ خلق
ہر لحظہ جن کو مد نظر ہے رفاہ خلق

دی التماس شوق کو عزت قبول کی
جلسہ میں یعنی آ کے صدارت قبول کی

پادشہ عصر حضرت نواب رامپور
شہرت ہے جن کے جوش سخا دل کی دور دور

خلق حضور کی بخدا ہے گواہ خلق
مداح وصف ذات سیادت پناہ خلق

روشن ہے ان کے فیض سے ہر گوشۂ زمیں
اس آفتاب کی کرنیں کس جگہ نہیں

ہاں پھر لپٹ بنعرۂ جوش سرور ہو
مشکورِ قدوم والیٔ بلرام پور ہو

ہر جلسہ اکابر و اعیان لکھنؤ
یہ سب رئیس جانِ اودھ جانِ لکھنؤ

یہ مجمع تعلقہ داران ذی وقار
گلدستۂ وفا ہیں یہ رنگینیٔ بہار

یہ اہل دل تمام بہی خواہ ملک ہند
اکثر مشیر خاص شہنشاہ ملک ہند

ہے دھن یہی جنھیں کہ ترقی ہو ملک کی
تجویز کرتے رہتے ہیں باتیں نئی نئی

ہندوستان کی نبض کو پہچانتے ہیں یہ
ہے نفع بخش ویدک و طب جانتے ہیں یہ

لازم ہے ان علوم کے کالج بنائے جائیں
جیسے مریض ویسے معالج بنائے جائیں

اٹھا اسی غرض سے سحاب بحار طب
ہمدرد قوم حاذق ملک اعتبار طب

دہلی جو تخت گاہ ہے اس ملک ہند کی
بنیاد اس میں ایسے ہی کالج کی ڈال دی

وہ خیر خواہ ملک جو کرنا تھا کر چکا
اب دیں مدد یہ فرض ہے اعیان ملک کا

غزل

کرسی کو صدارت کی ہے زیب ہنر ور سے
ساقی وہ گھٹا اٹھے اس وقت کہ ہُن برسے

نواب نہیں آئے مہراج تو بیٹھے ہیں
گلچیں سے کہو بھر لے دامن زر و گوہر سے

فیاضوں کا مجمع ہے لہر آئی وہ لہر آئی
اٹھنے ہی کو ہیں موجیں ہمت کے سمندر سے

گنگا بہے وید کی ہو دجلہ رواں طب کا
یہ چشمے ابل اٹھیں بنیاد کے پتھر سے

منہ کھول دے خم کا اے ساقی دریا دل
اب کام نہیں چلتا پیمانہ و ساغر سے

کالج کے لیے ہم کو چندہ کی ضرورت ہے
امید بہت کچھ ہے فیاضیٔ قیصر سے

وہ ضیغم پُر صولت وہ خسرو ذی ہمت
کرتا ہے جہانبانی جو خامہ و خنجر سے

ہے ذرہ نوازی میں وہ بھی صفتِ قیصر — جو نائبِ قیصر ہے خوبیٔ مقدر سے

اے ملکِ اودھ تجھ کو نعمت یہ مبارک ہو — صوبہ پہ جو حاکم ہے بہتر ہے وہ بہتر سے

وہ کون سا دل ہوگا جس کو نہ محبت ہو — مسٹن سے کرم گستر لفٹنٹ گورنر سے

یہ نظم صفیؔ پڑھ کر ہے داد سخن لینا
احباب سخنور سے اور اپنے ہنر آور سے

نوٹ:۔ ۳۱ر جنوری ۱۹۱۴ء بسنت کا دن تھا۔ قیصر باغ لکھنؤ کی سفید بارہ دری میں ایورویدک طبی کالج کا ایک جلسہ زیرِ صدارت سر جیمس مسٹن منعقد کیا گیا تھا۔ اس جلسہ میں ملک کے والیان، امرا، اور روسا نے بھی شرکت فرمائی تھی۔ حاذق الملک حکیم محمد اجمل خاں کی فرمائش پر لسان القوم صفیؔ لکھنوی نے یہ نظم کہی تھی۔ جس وقت مصنف نے نظم کا یہ پہلا شعر پڑھا ہے۔ ؎

ساقی تجھے بسنت کی بھی کچھ خبر نہیں
محنت کشوں کی زردیِ رُخ پر نظر نہیں

سارا مجمع جھومنے لگا۔ جیسے جیسے نظم آگے بڑھتی گئی ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ گویا بسنت رُت کی فضائیں دور دور سے سمٹ کر سفید بارہ دری کی جانب آ رہی ہوں اور سرسوں، گیندے کے پھولوں کی زردی نے پوری بارہ دری کو اپنی آغوش میں لے لیا ہو۔ حاذق الملک نے یہ نظم مطبع معیار لکھنؤ سے چھپوا کر جلسہ میں تقسیم کرانے کا بندوبست کیا تھا۔ آبر لکھنوی نے موسم کی مناسبت سے نظم کا سرورق بسنتی رنگ سے چھپایا تھا۔ اس نظم پر شیخ ممتاز حسین جونپوری کی ایک چھوٹی سی لیکن نہایت دلکش تمہید بھی ہے۔

سید زائر حسین کاظمی

قطعہ

اس قدر ہم نے اٹھائے غمِ احباب کے داغ
دل میں طاقت نہ رہی آہ و بکا کی افسوس

شمعِ بزمِ شعرا برج نرائن چکبست
بے وفا عمر نے تم سے نہ وفا کی افسوس

داغِ فرقت سے تمھارے ادبِ اردو پر
دہر سفاک نے اک تازہ جفا کی افسوس

شورِ ماتم ہے بپا حلقۂ احباب میں آج
شان اس بزم میں ہے بزمِ عزا کی افسوس

ہائے بے تابیِ دل اور وہ بے تابیِ دل
جب زباں بند ہوا اک نکتہ سرا کی افسوس

چارہ جویوں کے دلوں میں بھی یہ حسرت ہی رہی
ملی مہلت نہ دوا کی نہ دعا کی افسوس

سفرِ مختصر اے دوست تمھارا کیا تھا
ابتدا تھی سفرِ ملکِ بقا کی افسوس

قطع کی یکہ و تنہا رہِ پرخوفِ عدم
دست کش ہو کے رفاقت سے عصا کی افسوس

اے گلِ سرسبدِ گلشنِ کشمیر تجھے
راس آئی نہ ہوا دارِ فنا کی افسوس

موت نے خاک کے پردے میں چھپایا اس کو
ایک تصویر جو تھی ذہن و ذکا کی افسوس

موت آنے کو تو آئی سرِ بالیں لیکن
ہاتھ ملتی رہی تا دیر کیا کی افسوس

کھل رہا تھا جو گل اس گل کو خزاں نے لوٹا
منزلیں طے نہ ہوئیں نشو و نما کی افسوس

ہے سیہ پوش جماعت وکلا کی صد حیف
تیرہ و تار ہے محفل شعرا کی افسوس

دلِ احباب شکستہ ہے کمر بھائی کی
تم نے کس عمر میں چکبست قضا کی افسوس

لکھنے بیٹھا جو صفی واقعۂ درد انگیز
تھا زباں پر قلمِ تلخ نوا کی افسوس

نوٹ:- ۱۲ فروری ۱۹۳۹ء کو یوم چکبست منایا گیا تھا جس میں آنند نرائن ملا، مرزا جعفر علی خاں اثر، جوش ملیح آبادی، عزیز لکھنوی وغیرہ نے شرکت کی تھی اور ہر شاعر نے منظوم خراج عقیدت پیش کیا تھا۔ صفی لکھنوی نے بھی یہ قطعہ پڑھا تھا۔ سید زائر حسین کاظمی

بیٹی کی رخصتی

سچ ہے رخصت بیٹی کی اک سخت مصیبت ہوتی ہے — بیٹی ماں کے دل پھٹتا ہے جھکوں ہچکوں روتی ہے
اپنے سے اچھا دیکھ لیا جب دل پر پتھر غم کا دھرا — کب قسمت سے بس چلتا ہے ہونی آخر ہوتی ہے
آنکھوں کا تارا گھر کا اجالا جوگ کرا کر پالا جسے — جاتی ہو سسرال وہ بچی سب سے مل مل کر روتی ہے
بھائی بہن ماں باپ چھٹے یہ اپنی خوشی کو آپ چھپے — اب بدلا زیست کا نقشہ جان اس غم سے کھوتی ہے
بیاہ کے جس گھر میں جانا ہے کب اپنا۔ وہ بیگانہ ہے — اس دنیا سے اس دنیا کی بات نرالی ہوتی ہے
کشتی ہے منجدھار میں دل کی ساس کی دہشت نند کا ڈر — کیا جانے کس گھر میں قسمت اب جا کے ڈبوتی ہے
جس سے یہ سنجوگ ملا معلوم نہیں وہ ہے کیسا — دل ہی دل میں کڑھتی ہے اور چپکے چپکے روتی ہے
بزم مسرت بھی گویا ہے ایک مرقع عبرت کا — ساتھ جو لینے آئی ہے خود منہ آنکھوں سے دھوتی ہے
دروازہ پر ڈولا رکھا ہے۔ برپا ہے ہنگامۂ حشر — گھر سے جنازہ جاتا ہے یا لڑکی رخصت ہوتی ہے

نوٹ:۔ اس نظم میں مقطع نہیں ہے ہو سکتا ہے کہ اس کے کچھ اور اشعار ہوں لیکن مجھے اور اشعار نہ مل سکے۔ مرزا کاظم علی قمر لکھنوی، جو مولانا صفی کے شاگرد تھے نے یہ نظم دیتے ہوئے کہا تھا کہ یہ نظم استاد نے اپنے ایک دوست کی لڑکی کی رخصتی کے موقع پر نظم کی تھی۔

سید زائر حسین کاظمی

محمود آباد کی لائبریری

نصب جب عہدِ رسالت میں ہوا سنگِ حرم   ہر قبیلے کی یہ خواہش تھی اٹھائیں اسے ہم
ہوا اس وقت یہ ارشادِ رسولِؐ اکرم   کچھ قبائل کے نمائندے فقط مل کے بہم

پہلے اک چادرِ رنگیں پہ لٹائیں پتھر
تھام کر پھر اُسی چادر کو اٹھائیں پتھر

دیکھو جس امر کا حضرتؐ نے دیا تھا فرماں   اُس سے تھی عدل و مساوات کی اک شان عیاں
اُسی تعلیم پہ صد شکر بلطفِ یزداں   کاربند آج بھی ہیں راجہ امیر احمدؐ خاں

کعبۂ علم ہے ازبسکہ کتب خانہ بھی
رسمِ تاسیس میں ملحوظ ہے انداز وہی

ہو مبارک تجھے اے خطۂ محمود آباد   پڑی معنی کدۂ علم کی تجھ میں بنیاد
آئے ہیں کھنچ کے ہر اک صوبے سے چیدہ افراد   خاطرِ راجہ و مہراج کمار آج ہے شاد

ہوگا تعمیر کتب خانہ سقراطیہ
اے زہے وسعتِ پیمانۂ سقراطیہ

اہلِ سیرِ کتب کیوں نہ ہوں جو ہیں ذی ہوش   درحقیقت ہیں کتابیں رفقائے خاموش
مئے حکمت کا انھیں بوتلوں میں ہے سرجوش   نظر آتی ہیں جو الماریوں میں دوش بدوش

کاغذی پتلیاں پیمانہ کشِ حسنِ ادب
آنکھوں ہی آنکھوں میں کہہ جاتی ہیں سارا مطلب

نسخے مصروف ہیں خاموش گل افشانی میں ۔۔۔ دیکھ لیں آپ جو ہو دخل زباں دانی میں
دن میں یا روشنیٔ شمع شبستانی میں ۔۔۔ حالِ دل مرتسم ان کے خط پیشانی میں

کھول کر جلد جہاں کوئی سفینہ دیکھا
بند سینہ میں جواہر کا دفینہ دیکھا

ان مشاہیر سے منظور جو ہو قال و مقال ۔۔۔ جن کو گذرے ہوئے دنیا میں ہوئے صدہا سال
آتی دور اب ہیں کہ پہنچے نہ جہاں پیک خیال ۔۔۔ جمع اس میں ہیں انھیں لوگوں کے زریں اقوال

ان کے پڑھنے سے کبھی دل کو نہ ہوگی سیری
منظرِ عالمِ ارواح ہے لائبریری

نوٹ :۔ راجہ امیر احمد خاں آف محمود آباد نے ایک بہت بڑی لائبریری کی بنیاد ڈالی تھی ۔ اور اس کا نام سقراطیہ لائبریری رکھا تھا ۔ آج بھی یہ لائبریری موجود ہے اور اردو ادب کا بہت بڑا ذخیرہ اس میں موجود ہے ۔

سید زائر حسین کاظمی

جذبۂ اسلام

زندہ ہیں اگر زندہ دنیا کو ہلا دیں گے
مشرق کا سرا اُٹھ کر مغرب سے ملا دیں گے

دھارے میں زمانے کے بجلی کا خزانہ ہے
بہتے ہوئے پانی میں ہم آگ لگا دیں گے

ہم سینۂ ہستی میں انگارہ ہیں انگارہ
شعلے بھڑک اٹھیں گے جھونکے جو ہوا دیں گے

ہم کون ہیں ہم کیا ہیں ہم کچھ بھی نہیں لیکن
وقت آنے دو وقت آئے پھر تم کو بتا دیں گے

فاراں پہ گرجتے تھے برسے ہیں جہاں بھر میں
گھر گھر جو کہیں کڑکے پھر ہوش اڑا دیں گے

دنیا کے سمندر میں ہم جسر بھی ہیں مد بھی
دیکھو جو ہمیں رد کا طوفان اٹھا دیں گے

مرجھائی ہوئی کھیتی اب ہم ہیں تو کیا ڈر ہے
چھینٹے ہمیں رحمت کے پھر نشو و نما دیں گے

جڑ ہم نے پکڑ لی ہے کلّے نئے پھوٹیں گے
گر خاک میں بھی ہم کو اک بار ملا دیں گے

ایران ہو یا ترکی دونوں کو مٹا دیکھیں
کیا صفحۂ ہستی سے اسلام مٹا دیں گے

اسلام کی فطرت میں قدرت نے لچک دی ہے
اُتنا ہی پھر اُبھرے گا جتنا کہ دبا دیں گے

گونجیں گی پہاڑوں میں تکبیر کی آوازیں
یہ صور جہاں پھونکا مُردوں کو جگا دیں گے

اے جذبۂ اسلامی جس دل میں نہ تو ہوگا
یہ نظمِ صفی پڑھ کر ہم اس کو سنا دیں گے

نوٹ:- یہ نظم ۱۹۱۲ء میں کہی گئی تھی۔ اس کے متعلق مفصل معلومات کے لیے "صحیفہ" (یادگار صفی) کے صفحات ۶۷ تا ۷۰ کے نوٹ ملاحظہ فرمائیے۔

سید زائر حسین کاظمی

علی گڑھ

اے علی گڑھ خواب گاہِ سید عالی مقام | تیری یونیورسٹی ہے درسگاہِ خاص و عام
فاتحہ کو قبرِ سید پہ باشوقِ تمام | آ گیا یہ خادمِ ملت صفیؔ مستہام

منزلِ رحمت مزارِ بانیٔ دارالعلوم
بن کے شبنم گوہر افشاں جس پہ ہیں اشکِ نجوم

سید احمد خان بہادر رہنمائے مسلماں | سرگروہِ ملتِ اسلام میرِ کارواں
امتِ مرحومہ کو پا کر نحیف و ناتواں | ہو گئے مصروفِ ہمدردی بلطفِ بیکراں

قوم کی تعلیم کا ساماں مہیا کر دیا
روح پھونکی علم کی مُردوں کو زندہ کر دیا

یہ مدینہ علم و حکمت کا ہے ان کی یادگار | خود علی گڑھ سے علیؓ بابُہا ہے آشکار
چاہیے طلاب ہیں جتنے قطار اندر قطار | ہو مساوات و اخوت سب کا اسلامی شعار

جو بھی ہیں اس جامعہ کے گود کے پالے ہوئے
ایک ہی سانچے میں ہوں معلوم سب ڈھالے ہوئے

مختلف پھولوں کا ہے ہندوستاں رنگیں چمن | لالہ و گل بھی یہاں ہیں نیز نسرین و سمن
چاہیے مل جل کے رہنا شیخ ہو یا برہمن | دل وہ پتھر ہے اگر اس میں نہیں حُبِ وطن

اختلافِ مذہب و ملت یہ ہے اک اور چیز
ان مباحث میں نہیں پڑتے جو ہیں ہر دلعزیز

اپنے بیٹے کی موت پر

صفیؔ صبر کی دل پہ رکھ لی ہے سِل — مگر حادثہ! دل شکن، جاں گسل
مرا چھوٹا بیٹا مظفر حسین — مرا پارۂ دل مرا نورِ عین
ملازم جو میونسپلٹی میں تھا — وہ تھا انسپکٹر مکانات کا
ہوا اس کے مرنے سے دل اب دو نیم — بہو رانڈ ہے پانچ بچے یتیم
ہیں بچے بھی سب ہیں ابھی خُرد سال — ہے دردِ یتیمی سے حالت نڈھال
نہیں پرورش کا سہارا کوئی — بضاعت یہی سب ہیں مرحوم کی
میں دل خستہ خود اب لبِ گور ہوں — تو پھر پرورش ان کی کیونکر کروں
جو کشتی کا تھا ناخدا چل بسا — بھنور میں ہے کشتی خدا ناخدا
ہوا اک زمانہ کہ ہوں گوشہ گیر — اُٹھے بار کیونکر کہ ہوں اب تو پیر
کر امداد تو ہی کریم الرحیم! — ہے اک بیوہ ماں پانچ بچے یتیم

طبیعت ہے بے انتہا مضمحل
سناؤں کسے آہ یہ دردِ دل

نوٹ:۔ صفیؔ لکھنوی کے تین صاحبزادے تھے۔ سید حسن عسکری سب سے بڑے تھے۔ شعر و شاعری کا شوق تھا۔ حسنؔ تخلص کرتے تھے۔ دوسرے صاحبزادے کا نام سید منظور علی وصی تھا۔ سب سے چھوٹے لڑکے کا نام سید مظفر حسین عرف تبن تھا۔ یہ لکھنؤ میونسپلٹی میں انسپکٹر تھے۔ ۸ ستمبر سنہ ۱۹۴۸ء کو ان کا انتقال ہوا۔ ان کے انتقال سے صفیؔ مرحوم کو بڑا صدمہ پہونچا تھا۔ تبن صاحب مرحوم کے تین لڑکے اور دو لڑکیاں تھیں۔ ایک لڑکا حوض میں ڈوب کر مر گیا۔ دوسرا سنہ ۱۹۶۹ء میں شیعہ سُنی جھگڑے میں مارا گیا۔ تیسرا لڑکا گونگا ہے۔ لڑکیوں کی شادی ہو چکی ہے۔ تبن مرحوم کی بیوہ ابھی ذی حیات ہیں۔

سید زائر حسین کاظمی

غزل حالیہ

ہم اپنا دردِ دل رو رو کے بے تابانہ کہتے ہیں
الٰہی خوش رہیں وہ جو ہمیں دیوانہ کہتے ہیں

اسی شہرِ خموشاں میں جسے ویرانہ کہتے ہیں
سنو ذرّے زبانِ حال سے افسانہ کہتے ہیں

انھیں کا دور تھا وقفِ عروجِ نشۂ دولت
چھلکتا تھا ترقی کا جسے پیمانہ کہتے ہیں

بنائے خیر قائم کر کے گہری نیند سوئے ہیں
اسی کو اہلِ ہمت ہمتِ مردانہ کہتے ہیں

کمایا عمر بھر خود اور امین اس کا کیا تم کو
اسی کا نام ہے الفت اسے یارانہ کہتے ہیں

مگر قربان ہم اپنی اس اندازِ تمدّن کے
یگانے کیا کہیں گے جو ہمیں بیگانہ کہتے ہیں

نظر ان پر نہیں اے قوم جو تیرے فدائی ہیں
اسے بھی ہم ترا اک نازِ معشوقانہ کہتے ہیں

یہ تنگ آئے ہیں مرنے تک ہماری قوم کے ہاتھوں
ابھی تک چپ تھے لو ہم آج آزادانہ کہتے ہیں

ہماری زندگی بھی کتنی عبرت خیز تھی یارب
کہ جس کے حال کا افسانہ گو افسانہ کہتے ہیں

نظر آتی ہے داغِ دل سے جو سوزِ محبت کی
کہ سب اس کو چراغِ مشہدِ پروانہ کہتے ہیں

کبھی گورِ غریباں کی طرف بھولے سے آ نکلو
اس آبادی کو بھی دیکھو جسے ویرانہ کہتے ہیں

کرم ہائے کسے گستاخ کرد آخر صفیؔ مارا
جو وہ افسانہ سنتے تو ہم افسانہ کہتے ہیں

نوٹ۔ لسان القوم صفیؔ لکھنوی نے یہ غزل پیش کر کے قومی حالات کا نقشہ کھینچا ہے۔ اور ہمدردانِ قوم کو للکارا ہے کہ وہ قوم کے لیے زندہ رہیں اور مریں۔

سید [illegible] حسین کاظمی

قطعۂ وداعیہ

وہ مہمان آئیں وہ مہمان آئیں
اسی دن کی ہم مانگتے تھے دعائیں

کہیں دل نے چھیڑا ہے پھر سازِ ماتم
سنوار ہی ہیں یہ کیسی صدائیں

خدا حافظ اے قوم کے جاں نثارو
نہ بھولیں گی ہرگز تمھاری وفائیں

معاف اے گرے جانے والے مسافر
اگر ہم سے کچھ ہو گئی ہوں خطائیں

چمکتے ستارو چمک یوں دکھادو
کہ پھر غیر قوموں کو ہم منہ دکھائیں

کنول اک ذرا دل کا کھلنے نہ پائے
پریشاں بہت چل رہی ہیں ہوائیں

یہ بگڑی ہوئی زلف کیسی سنواری
ادھر آؤ لے لیں تمھاری بلائیں

نوٹ:۔ آل انڈیا شیعہ کانفرنس کا دوسرا سالانہ اجلاس جو ۱۹۰۶ء میں لکھنؤ میں ہوا تھا اُس اجلاس کے خاتمہ پر یہ وداعیہ قطعہ لسان القوم صفی لکھنوی نے پڑھا تھا اور دوسرے مقاموں سے آئے ہوئے مہمانوں کو لکھنؤ سے رخصت کرتے وقت معذرت طلب ہوئے تھے اور تمنا کی تھی کہ شیعہ قوم بھی ملک کی دوسری قوموں کی طرح پھولے اور پھلے۔ اس اجلاس میں گذشتہ اختلافات دُور ہو چکے تھے اور قوم کا ہر فرد کندھے سے کندھا ملا کر خدمت کرنے کے لیے آمادہ ہو چکا تھا۔ اسی جانب آخری شعر میں اشارہ کیا گیا ہے۔

سید زائر حسین کاظمی

صبر

دل کے اندر جب اٹھے جوشِ ہوا کا طوفان — اور ثابت قدم اس میں رہے نفسِ انسان
قوتِ صبر یہی ہے یہی اے فلسفہ داں — صبر دنیا میں ہے اک سلسلۂ کوہِ گراں

دل وہی دل ہے کہ ہو صبر کی قوت جس میں
صبر ہی نفس کا لنگر ہے نہیں شک اس میں

قوتیں جتنی ہیں ان سب میں یہ قوت ہے بڑی — اس کے پنجہ میں قوائے غضبی و شہوی
روک دیتا ہے یہی نفس کی مستانہ روی — خون کو باز نہ رکھے جو دمِ تیز روی

اضطراری حرکات ایسے ہوں پیدا دل سے
کہ سنبھالیں بھی تو سنبھلے یہ ذرا مشکل سے

صبر ہی کی تو یہ تعلیم ہے جاں بازوں کو — خوگر ضبط کریں درد کی آوازوں کو
مل سکے تا کہ نہ موقع کوئی غمازوں کو — لبِ شیون نہ کرے فاش دلی رازوں کو

تشنۂ لذتِ آبِ دمِ شمشیر رہے
جان لے حسن تو یہ عشق کی تقصیر رہے

دے چکا تو دلِ مجرم کو مرے حکمِ سزا — اب نہ روؤں گا نہ میں عذر کروں گا اصلا
صبر کے ساتھ مگر ہاں بتقاضائے وفا — دشنہ زن خون بھرے ہاتھ ترے چوموں گا

جب کہ ان ہاتھوں سے زخمی دلِ مضطر ہو گا
پائے نازک پہ بصد عجز ادب سے سر ہو گا

جسمِ نازک پہ ترے صبر بہشتی ہے لباس — اور اک ساغرِ لبریزِ قناعت ترے پاس
ڈگمگا کے اسے پیتا ہے ستاتی ہے جو پیاس — پھر زمانہ تہ و بالا ہو تو کیا تجھ کو ہراس

کل جو آئے گی قیامت ابھی آ کے دیکھے
غالبؔ تو نہ ادھر آنکھ اٹھا کے دیکھے

صبر اے عرشِ محبت کے ستارے اے صبر — صبر اے غمزدہ ہر دل کے سہارے اے صبر
ڈبڈبائی ہوئی ان آنکھوں کے تارے اے صبر — دیکھتے ہیں جو خطرناک نظارے اے صبر

صبر کچھ شک نہیں اللہ کا محبوب ہے تو
مرہمِ زخمِ تنِ خستۂ ایوب ہے تو

سدّ و قوتِ تحریکِ ارادی ہیں نفوس — دل میں تُو ہو تو اذیت نہیں ہوتی محسوس
رحمتِ حق سے ہیں کیا تیری نگاہیں مانوس — کہ پلٹتی ہی نہیں یہ کبھی ہو کر مایوس

خلعتِ فاخرہ صاحبِ معراج ہے تو
ملکی نفس کی تکمیل کا سرتاج ہے تو

چمنِ خلد ہے اے صبر ترا مولدِ پاک — سیرگہِ ساعتِ افلاک ہے تا مرکزِ خاک
خلشِ خارِ الم سے ہے جو سینہ صد چاک — خونچکاں رختِ کفن تیری شہانی پوشاک

تیرے اس ضبط پہ اے صبر کسے رشک نہیں
دل میں ہے گھاؤ مگر آنکھ میں اک اشک نہیں

صبر اے گنجِ محبت کے لٹانے والے — خاکساری دلِ انساں کو سکھانے والے
صبر اے حسنِ عقیدت کے بڑھانے والے — سکۂ امن قلمرو میں بٹھانے والے

گو شکستہ پر و دست پہ جاری ہے حکومت تیری
جتنی ہے روح میں قوت وہ ہے قوت تیری

باندھ دی خندۂ شیریں کی مٹھائی تو نے — آگ غصّے کی تحمّل سے بجھائی تو نے
ہستیِ بغض و حسد دل سے مٹائی تو نے — گردنِ قہر سرِ خاک جھکائی تو نے
تیری مٹھی میں ہے اے صبر زبانوں کی لگام
قوتِ دستِ تعدی کا دبانا ترا کام

تو نے پامال کیا حرص و ہوا کا خرمن — خارزارِ دلِ ویراں کو بنایا گلشن
اک نظر جس کی طرف پھر گئی تیری چتون — صفت کاہ سُبک اس کو ہوا کوہِ محن
مہر کرتا سنداً تو نہ اگر صبر جمیل
محضرِ خونِ شہیداں کی نہ ہوتی تکمیل

ملک میں تو سبق آموزِ وفاداری ہے — ہر عبادت کدہ میں عہد پرستاری ہے
خانوادوں میں ہم آہنگی و ہمواری ہے — الغرض حکم ترا چار طرف جاری ہے
تو ہی دیتا ہے غریبوں کو دلاسا اے صبر
معتدل تجھ سے مزاجِ اہلِ دل کا اے صبر

منکسر تو ہی امارت کو بنا دیتا ہے — خوش مزاجی دلِ مفلس کو سکھا دیتا ہے
طعن و تشنیع سے سن کے اڑا دیتا ہے — کوسنے دے جو تجھے اس کو دعا دیتا ہے
درگذر ہم کو سکھاتا ہے دل آزادوں سے
معذرت پہلے معافی کے طلب گاروں سے

حق پرستوں کے لیے مایۂ عشرت ہے صبر — منکروں کے لیے ایمان کی دعوت ہے صبر
عورتوں کے لیے آرائش زیور ہے صبر — اور ترقی کے لیے مردانِ طریقت ہے صبر
چاہے جس طفل و جواں پیر میں ہو خوب ہے صبر
بلکہ ہر عمر میں ہر جنس میں محبوب ہے صبر

جادۂ راہ پسندیدۂ خاصانِ خدا — دائرہ دنیا میں نہیں صبر تحمل کے سوا
دیکھنا ہو جو تمھیں منظرِ تسلیم و رضا — بت کدہ میں نہ حرم میں ہے مرقع ایسا
سعی کعبہ میں نہ کوشش طرفِ دیر کرو
امتحاں گاہِ محبت کی چلو سیر کرو

آؤ اک صبر کی تصویر دکھائیں تم کو — صورتِ عاشقِ دلگیر دکھائیں تم کو
عشق کا جذبۂ تاثیر دکھائیں تم کو — جنبشِ پردۂ تقدیر دکھائیں تم کو
پرتوِ شاہدِ وحدت کی زیارت کر لو
ہاں مگر پہلے نگاہوں کی طہارت کر لو

خاص بندہ کوئی اللہ کا ہے یہ بےشک — ٹکٹکی باندھے ہوئے دیکھ رہا ہے سوئے فلک
زرد رخساروں میں سورج سے زیادہ ہے چمک — کہیں رعشہ ہے بدن میں نہ جھپکتی ہے پلک
کس قیامت کی ہیں مظلوم نگاہیں دیکھو
سات پردوں میں خموشی کی ہیں آہیں دیکھو

خارزارِ ستم آباد میں اعضا مجروح — دلِ غربت زدہ مجروح کلیجہ مجروح
فوجِ بیداد کے نرغے میں یہ تنہا مجروح — ہمہ تن چاک ہے زخموں سے سراپا مجروح
کوئی بتلائے یہ ہمت ہے یہ ہمت کیسی
لب پہ ہے زمزمۂ شکر شکایت کیسی

دینِ شرمندۂ دنیا ہو یہ منظور نہیں — ورنہ مختار ہے کچھ صبر پہ مجبور نہیں
کون کہتا ہے کہ محصور ہے محصور نہیں — دب سکے کثرتِ ظلمت سے یہ وہ نور نہیں
جو بلا گھیرے ہوئے ہے ابھی ہٹ سکتی ہے
اک اشارے میں زمیں رن کی الٹ سکتی ہے

دیکھ لو اور اگر دیکھ سکو اک تصویر | باپ کی گود میں وہ چاند کا ٹکڑا بے شیر
جس کے سوکھے ہوئے حلقوم میں پیوست ہے تیر | مسکراہٹ کہے دیتی ہے کہ ہوں بے تقصیر
میں تو مہمان تھا دعوت کا یہ سامان کیسا
قطرۂ آب کی جا قطرۂ پیکاں کیسا

اب تک اسلام اسی صبر کا ہے شرمندہ | اور امید یہی ہے کہ رہے آئندہ
جس قدر فخر کرے اس پہ وہ ہے زیبندہ | دین نانا کا نواسے نے کیا پھر زندہ
غیر کا خون کہو گے کہ اسے خونِ نبیؐ
جس نے اسلام کی سوکھی ہوئی کھیتی سینچی

نہیں واللہ صفیؔ رسمِ عزاداری بد | یادگار اس کی ہے تھا جو کہ نشانِ احمدؐ
یہ بتاتی ہے ہمیں قوتِ اخلاق کی حد | صبر تلخ است ولیکن برِ شیریں دارد
شہِ مظلوم ترا نام رہے گا باقی
ساتھ اس نام کے اسلام رہے گا باقی

نوٹ:۔ سرفراز ہفتہ وار کے محرم نمبر کے لیے یہ نظم لکھی گئی تھی جس میں شاعر نے پہلے صبر کی خصوصیات اور اوصاف بتائے ہیں پھر صبرِ حسینی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ حسین جیسا صابر کوئی نہیں گزرا جس نے اسلام زندہ رکھنے کے لیے اپنے کو لٹا دیا اور صبر کیا۔ صبر کی اہمیت کو اس نظم میں اجاگر کیا گیا ہے۔

سید زائر حسین کاظمی

آزاد کی صدا

نظمِ صفی نہیں یہ آزاد کی صدا ہے — سُن آ کے سننے والے بابا ترا بھلا ہے
دل پر اثر کرے گا نالہ اگر رسا ہے

اے قوم یہ نہیں ہے مضمونِ شاعرانہ — اے قوم یہ نہیں ہے اک من گھڑت فسانہ
جاں کاہ واقعہ ہے غمناک ماجرا ہے

ہڈ ماسٹر ہیں شیعہ اک لکھنؤ کے اندر — ان کو یہ لکھ رہا ہے عیسائی ایک ٹیچر
"شیعہ ہے ایک لڑکا جو بھیک مانگتا ہے"

"وہ ہونہار لڑکا ہے تربیت کے قابل" — "مجبور ہوں کروں کیا دکھتا ہے گو مرا دل"
اسکول یہ مشن ہے یہ غیر قوم کا ہے

"کیا اپنے مدرسے میں آپ اس کو لے سکیں گے" — تعلیم و تربیت میں امداد دے سکیں گے
تو ہی بتا دے اے قوم اس کا جواب کیا ہے

لکھتا ہے پھر خطوط میں وہ قوم کا معاون — یعنی اسی طرح کا لڑکا کوئی کرسچن
"گر آپ بھیج دیں تو احسان آپ کا ہے"

کیوں نازپروردانِ آغوشِ حبِ قومی — آئے گا تم کو آخر کب جوشِ حبِ قومی
اُف! قوم کا تمھاری کیا حال ہو رہا ہے!!

سب ہونہار پودے پامال ہو رہے ہیں — لہو و لعب میں ساری عمر اپنی کھو رہے ہیں
یہ بھی خبر نہیں کچھ تعلیم کیا بلا ہے

دیکھو تمام قومیں کس طرح بڑھ رہی ہیں — علمی بلندیوں پر بے لاگ چڑھ رہی ہیں
قوم ایک یہ جو گویا بالکل شکستہ پا ہے

دل میں نہ حبِّ قومی اس کے نہ جوشِ دینی کوتاہیٔ نظر سے محروم دور بینی

کورانہ چل رہی ہے اور ہاتھ بے عصا ہے

رکھتی ہیں اور قومیں کیسے معابد اپنے ہم نے بھی جا کے دیکھے اکثر مساجد اپنے

برصفی نہ صحن کے اندر کوئی نہ بوریا ہے

ہم نے تمام دولت اپنی تباہ کر دی فردِ عمل دو رویہ بالکل سیاہ کر دی

قطعی ہمیں روا ہے شرعاً جو ناروا ہے

بے وجہ مشغلوں سے فرصت نہیں ہے دم بھر رندانہ ولولوں سے فرصت نہیں ہے دم بھر

دل ہرزہ کاریوں میں ہر وقت مبتلا ہے

اسلاف کی کمائی اخلاف نے اڑائی نیت میں ناصفائی زہد اپنا سب ریائی

دل میں صنم ہے لب پر خدا خدا ہے

یہ گھر نہیں تمہارا جس گھر میں تم کھڑے ہو دنیا کے رہنے والو کس بھول میں پڑے ہو

دنیائے چند روزہ اک عاریت سرا ہے

اے دوستو یہ ڈر ہے سختی کہیں نہ جھیلو جانا ہے دور تم کو زادِ سفر تو لے لو

پچھتاؤ گے نہیں پھر مخدوش راستہ ہے

دنیا کے دائرے کو دو جتنی چاہے وسعت لیکن رہے نظر میں وہ مرکزِ شریعت

اسلام جو تمہارا تم کو بتا رہا ہے

اس نقطۂ نظر سے دیکھیں جو بالضرورت درکار قوم کو ہے ایسی بھی اک جماعت

روحانیت کا جس میں عنصر بڑھا ہوا ہے

ترویجِ دین و ملت یہ مشغلہ ہے اس کا ناطق امورِ دیں میں ہر فیصلہ ہے اس کا

پیرو ہے قوم اس کی وہ فرقہ پیشوا ہے

شائستہ قوم ہر اک پابند ہے اسی کی اور ہم کو تو ضرورت ہر چند ہے اسی کی
روحانیت کا حصہ جب نسبتاً سوا ہے

اے قوم شیعہ حاصل کر دنیوی وجاہت لیکن یہ پاک مذہب ہونے نہ پائے رخصت
جس کے اصول دیں کی خود عقل پر بنا ہے

مظلوم وہ مسیحا دین محمدی کا دکھلا گیا ہے تم کو کیا چیز ہے یہ دنیا
دعویٰ یہ مرے شاہد تاریخ کربلا ہے

مانا یہ میں نے مجھ کو تم معتمد نما ہو جو کچھ میں کہہ رہا ہوں اس کو سند نما ہو
اک جرمنی محقق کیا دیکھو لکھ رہا ہے

افسوس غیر قومیں سیکھیں زباں عرب کی تم کو نہ شرم آئے اپنے حسب نسب کی
اسلامیو! ابناءِ اسلام ہے یہ کیا ہے؟

اے پاک اے مقدس روحو مدد کرو تم منجدھار میں ہے کشتی سرگشتۂ تلاطم
چکرا رہی ہے وہ بھی جو عقل رہنما ہے

ہے مذہبی زباں کی تحصیل ہم کو لازم علم و ادب کے اس کے تکمیل ہم کو لازم
اخلاق کا خزانہ جس میں بھرا پڑا ہے

اس ہند میں جو فرقے بام ترقی جا رہے ہیں اخلاق کی کمی سے مبرا یہ جا رہے ہیں
تعلیم علم دینی اک جادۂ وفا ہے

آزادگی سے جس میں خوف خدا نہ ہوگا وہ دل کبھی مطیع فرماں روا نہ ہوگا
پابندی شریعت ہر درد کی دوا ہے

ہو قوم کو الٰہی توفیق نیک حاصل اپنے علوم سے بھی جاہل رہے نہ جاہل
آمین ثم آمیں اپنی یہی دعا ہے

بس بس صفیؔ کہاں تک یہ وعظ یہ نصیحت
جب قوم ہے ہماری اک قوم باحمیت
پیش نظر سب اس کے اپنا بھلا برا ہے

نوٹ:- آل انڈیا شیعہ کانفرنس کے اجلاس چہارم میں ۱۲؍اکتوبر ۱۹۰۰ء کو سید محسن مرزا صاحب مرحوم ایم۔اے دہلوی نے ایک تجویز پیش کی تھی کہ دنیا میں سب سے بڑی شے جہالت ہے اور علمیت اُس کی ضد ہے۔ کانفرنس کی یہ غرض اولیں ہے کہ وہ قوم کے افراد کے دل کو علم کے نُور سے منوّر کرے۔ اور ایک کالج قائم کرے جس کے لیے ایک الگ سے فنڈ قائم ہونا چاہیے۔ اس تجویز کی تائید مولوی حکیم خواجہ مختار احمد صاحب حنفی نے کی اور پھر لسان القوم سید علی نقی صفیؔ لکھنوی نے اس نظم سے تائید ثانی کی۔ اس نظم کا اتنا اثر ہوا کہ لوگ دھاڑیں مار مار کر رونے لگے۔ جلسہ ایک مجلس میں تبدیل ہو گیا۔ اُس وقت، ۹ حضرات نے نقد چندہ دیا جس کی فہرست اور رقم جلسے کی روداد میں دیکھی جا سکتی ہے۔ ان کے علاوہ مندرجہ ذیل حضرات نے جن کے پاس نقد نہ تھا اپنے قیمتی سامان پیش کر دیے۔

۱۔ مرزا محمد ذکی صاحب قزلباش	ایک گھڑی
۲۔ ہمشیرۂ سید علی حسین صاحب	۱۰ عدد نقرئی چوڑیاں
۳۔ سید ابوالحسن صاحب کربلائی	ایک عدد عقیق
۴۔ مولوی محمد حسین صاحب پیش نماز جانسٹھ	۱۲ جلدیں کتاب کی
۵۔ سید ظفر احمد ولد سید ضامن حسین	ایک گھڑی

صفیؔ لکھنوی کی شاعری میں یہ اثر تھا کہ جس کے پاس جو تھا وہ اُس نے پیش کر دیا اور جن کے پاس کچھ نہیں تھا انھوں نے وعدہ فرمایا اور بعد کو اپنے وعدے کو پورا کیا۔

سید ذائر حسین کاظمی

محبت

محبت کیا ہے میلانِ طبیعت — سوئے محبوب رجحانِ طبیعت

محبت کا جو پوچھو ٹھیک مبداء — تو بس ہے قوتِ تحریک مبداء

یہ قوت باعثِ ہر خیر و شر ہے — محبت بھی اسی کا اک اثر ہے

جو امرِ خیر سے ہوگی محبت — تو ہوگا نفس منسوبِ سعادت

اگر شر کی طرف ہے نفس مائل — شقاوت اس محبت کا ہے حاصل

تمیزِ نیک و بد دشوار ہوتی — نہ گر ادراک کے معیار ہوتی

یہی قوت ہے جو ہے رہبرِ نفس — اسی پر ہے مدارِ محورِ نفس

محبت کے نہیں قابل کوئی شے — جو خارج دائرہ سے عقل کے ہے

محبت جوہرِ آئینۂ دل — محبت گوہرِ گنجینۂ دل

محبت جوہرِ ہر دل عزیز است — برائے نفس معیارِ تمیز است

محبت شاہدِ معنی کا زیور — محبت روحِ خالص روحِ پیکر

محبت حکمرانِ بحر و بر ہے — جدھر دیکھو محبت جلوہ گر ہے

بہار آگیں ہے گلزارِ محبت — بہر سو گرم بازارِ محبت

دلوں پر نقش ہے نامِ محبت — بچھا ہے ہر طرف دامِ محبت

اسی صحرا کا ذرہ ہمسرِ انور — اسی دریا کا قطرہ ہے سمندر

اسی سے حسن کو ہے جامہ زیبی — اسی سے عشق میں یہ ناشکیبی

اسی سے سرو و قمری دوش بدوش — اسی سے بلبل و گل ہیں ہم آغوش

اسی سے نعرہ زن ہے شب کو سرخاب — دلِ پروانہ بہرِ شمع بے تاب

چکوریں ماہ پر شیدا اسی سے — شبِ مہ قہقہہ پیدا اسی سے

اسی سے آشنائے آب ماہی — فراقِ آب میں بے تاب ماہی

اسی سے ناچتے ہیں وجد میں مور — بندھا کالی گھٹاؤں کا جہاں زور

اسی سے ہر جگہ ہوتا ہے پابست — صدائے لے پہ ہر بادِ سیہ مست

اسی سے مہر پر حربا ہے عاشق — کنول کے پھول پر بھنورا ہے عاشق

اسی سے ہے دلوں میں ہوک اٹھتی — اسی سے کوئلیں ہیں کوک اٹھتی

اسی دھن میں پپیہا بولتا ہے — ہوائے شوق میں پر تولتا ہے

اسی سے چہچہے کرتے ہیں ہر آن — چمن میں صبح مرغانِ خوش الحان

صداؤں سے کبھی ہوتی ہے ظاہر — اداؤں سے کبھی ہوتی ہے ظاہر

کبھی ہوتی ہے آہوں سے نمودار — کبھی دلکش نگاہوں سے نمودار

دلِ نازک محبت کی ہے منزل — پری رازِ محبت شیشۂ دل

نگہ سے دل کا ملتا ہے جو انداز — اسے کہتے ہیں نبضِ دل نظر باز

ہیں آنکھیں مظہرِ نورِ محبت — کشادہ غرفۂ حورِ محبت

محبت ہے شرابِ روح پرور — دل اس کا شیشہ چشمِ لطف ساغر

دلِ خونِ گرم کی گھلانے والی — نگہ بنکر قیامت ڈھانے والی

محبت باعثِ حسنِ صفات — اسی قوت میں ہے زورِ کرامات

یہی ہے نسخۂ تسخیرِ عالم — یہی ہے حلقۂ زنجیرِ عالم

اسی سے نظمِ موجودات مربوط — مرادِ معنیِ پیوند مضبوط

وہی شے ہے محبت نام جس کا — خمِ گیسو ہے پیچاں دام جس کا

محبت کی کشش ہے جلوہ انگن — کہ مقناطیس سے کھنچتا ہے آہن

نہ ہوتی یہ اگر حکمِ خدا سے — نہ جذبِ کاہ ہوتا کہربا سے

یہ ہے جمادوں میں جانداروں میں ثابت — ثوابت اور سیاروں میں ثابت

جو پانی ماہ پر شیدا نہ ہوتا — کبھی یوں جزر و مد پیدا نہ ہوتا
نہ جذبِ حسن سے ہوتا جو بے تاب — کنویں سے کیوں نکل پڑتا نہ سیماب
کُرے میں ارض کے زورِ کشش ہے — اسی سے ہے وہ دامن گیر ہر شے
کشش ہر ایک سیارے نے پائی — خداوندا تری قدرت نمائی
یہ جذب و انجذابِ باہمی ہے — جو اب تک سدِّ راہِ برہمی ہے
اگر اس قید سے آزاد ہوتا — کرہ اس خاک کا برباد ہوتا
ہر اک ذرّے میں ہے جوشِ محبت — ہر اک قطرہ ہے مے نوشِ محبت
کہیں بیشی کہیں اس کی کمی ہے — محبت سے مگر دنیا تھمی ہے
اسی پر منحصر ہے ربطِ افراد — نظامِ اتحاد و جارِ اضداد
اسی سے روح و تن میں رابطہ ہے — یہی ہستی کا گویا ضابطہ ہے
ہر ایک ذرہ کے دل میں ہے محبت — ہماری آب و گل میں ہے محبت
کیا کس نے دلِ آدمؑ کو غمگین — فراقِ خلد میں با وصفِ تمکین
جب اُن کو ہجرِ حوّا پیش آیا — وہ کیا تھا جس نے آدمؑ کو رلایا
ہوا جب کشتۂ بے داد قابیل — کہو کیوں روئے آدمؑ بہرِ ہابیل
ہوئے بہرِ پسر کیوں نوحؑ مضطر — اٹھایا کس نے طوفاں دل کے اندر
ہوئے یوسفؑ سے جب یعقوبؑ مہجور — تو کون آنکھوں کا ان کی لے گیا نور
مہِ کنعاں کو دی کس نے عزیزی — زلیخا کو ملی کس سے کنیزی
بھرے لیلیٰ کا دم کس نے بتایا — دلِ مجنوں کو دیوانہ بنایا
مہیا کر دیا کس نے یہ سامان — غمِ شیریں میں دی فرہاد نے جاں
کیا ہے نل دمن کو کس نے مشہور — میانِ ہند از نزدیک تا دور
مآلِ قصۂ سلمیٰ محبت — حدیثِ وامق و عذرا محبت

محبت مایۂ ناز و نیاز است — گواہش حالِ محمود و ایاز است

یہ ہے گلدستۂ طاقِ خیالی — یہ ہے آئینۂ بزمِ مثالی

یہی ہیرو ہے دلکش ناولوں کا — یہی رونق ہے رنگیں محفلوں کا

زمانہ کل محبت ہے کہانی — اسی کے دم سے پرزوں میں روانی

محبت کا اگر خوگر نہ ہوتا — تو ہرگز صلح کا نخچیر نہ ہوتا

فنائے ہر نفاق اس پر ہے مبنی — بقائے اتفاق اس پر ہے مبنی

محبت الغرض ہے ایک نسبت — کہ دو جانب کی ہے جس کو ضرورت

یہ پیدا ہو نہیں سکتی ہے خالی — کہ دونوں ہاتھ سے بجتی ہے تالی

اگر ہو مطلبِ مطلوب طالب — کمال اتحاد ہر دو جانب

یہاں تک رفع اسباب دوئی ہوں — کہ آخر ایک سمجھے جائیں دونوں

تو یہ ہے بہترین جملہ اقسام — صداقت بس اسی حالت کا ہے نام

صداقت سے جو خالی ہے محبت — نہیں زنہار اس کو استقامت

وہ ہو بالطبع چاہے بالارادہ — دلوں کی استقامت کا ہے جادہ

چراغِ بزمِ عرفاں ہے محبت — دلیلِ راہِ عرفاں ہے محبت

خدا کو خود ہے بندوں سے محبت — ثبوت اس امر کا ہے جوشِ رحمت

خدا کے ساتھ بندوں کو محبت — اسی کا نام ہے حسنِ عبادت

محبت کا اگر ہوتا نہ پیوند — نہ ہوتی باپ ماں کو مہرِ فرزند

محبت گر نہ بنتی شیرِ مادر — تو پاتے پرورش اطفال کیونکر

یہی ہے دایۂ اطفالِ ناداں — یہی راتوں کو ہے گہوارہ جنباں

محبت ہی کا ہے اک رشتۂ خاص — زن و شو جس سے ہیں پابندِ اخلاص

محبت گر نہ ہوتی رسمِ حاشا — نہ کرتے ناتوانوں پر توانا

یہی ہے مرہمِ دلہائے خستہ   یہی ہے دستگیرِ پا شکستہ

یہی ہے اصلِ منشائے قوانین   یہی سرتاجِ آدابِ سلاطین

قوی تر ہے محبت کا تعلق   ہر اک قوت پہ ہے اس کو تفوق

محبت سے نکل سکتا ہے، وہ کام   نہ دے زورِ حکومت جس کو انجام

نہایت تجربہ کا یہ سخن ہے   حکومت کی محبت بیخ و بن ہے

دلا گرمی ہے محبت ہی کی گرمی   جو دل کو موم کر دیتی ہے نرمی

بنا دیتی ہے پھر نقشِ حکومت   مطیعِ شاہ ہوتی ہے رعیت

اطاعت کیا ہے یہ بھی تو یہی ہے   ملازم کا جو فرضِ منصبی ہے

مگر دل میں نہیں سچی محبت   تو مشکل ہے ادائے حقِ خدمت

کیفیت اگر طاری نہ ہوگی   کبھی دل میں وفاداری نہ ہوگی

نبستہ اصل و فرعِ آن وفاق است   محبت بیخِ نخلِ اتفاق است

مودت و فتوت کیا یہی ہے   مراعات و مروت کیا یہی ہے

محبت کو گھٹا دیتی ہے دوری   محبت کو بڑھاتی ہے حضوری

یہاں توضیح اتنی ہے ضروری   صحبت معنوی ہو خواہ صوری

طبائع کا توافق ہے مگر شرط   جزائے کار ہے ہو فوت اگر شرط

اسی باعث سے اکثر بے ارادہ   یہ ہم جنسوں میں ہوتی ہے زیادہ

کبوتر با کبوتر قاز با قاز   کند ہم جنس با ہم جنس پرواز

جو انساں میں نہو حیواں سے بدتر   جو زندہ میں نہو بے جاں سے بدتر

نہو جس ملک میں بے تخت ہے وہ   نہو جس قوم میں کم بخت ہے وہ

جو ہو منظور ہم جنسوں میں عزت   کرو اعلیٰ و ادنیٰ سے محبت

محبت ہی وہ جامہ ہے جو اکثر   مرتب ہے قدِ شاہ و گدا پر

صفی میزانِ خُلق و آدمیت

محبت ہے محبت ہے محبت

نوٹ: یہ نظم "محبت" انجمن دائرہ کی جانب سے چھپوا کر مفت تقسیم کرائی گئی تھی یہ دو ورق جس کا سائز ۱۸×۲۲ ہے پر چھپی تھی۔ اس میں چھپے ہوئے کُل ۱۰۱ اشعار تھے لیکن جو نسخہ میرے پاس موجود ہے اُس پر صفی لکھنوی کے ہاتھ کے ۳ اور شعر حاشیہ پر لکھے گئے ہیں۔ اشعار نمبر ۲، ۳، ۴، ۵، ۶، ۷، ۸، ۹، ۴۷، اور ۴۹ کو صفی لکھنوی نے قلم زد کر دیے تھے۔ لیکن ان کی ادبی افادیت کو دیکھتے ہوئے ان کو یہاں درج کر دیا گیا ہے۔

اس نظم کے چھپنے کے بعد جو تین اشعار مولانا صفی نے اپنے ہاتھ سے اضافہ کیے ہیں وہ نمبر ۹، ۱۱ اور ۳۷ پر درج ہیں ان کے علاوہ بہت سی ترمیمیں بھی صفی مرحوم نے اپنے دست مبارک سے سُرخ روشنائی سے کی ہیں جن کی تفصیل مندرجہ ذیل ہے۔

شعر نمبر ۱۲ کا مصرعہ اولیٰ پہلے یوں تھا۔ "محبت کا ہر اک شے میں اثر ہے" اور اب موجودہ حالت میں ہے۔
شعر نمبر ۳۳ کا مصرعہ ثانی پہلے اس طرح تھا "ہر اک سو گرم بازارِ محبت" اور اب موجودہ حالت میں ہے۔
شعر نمبر ۳۴ کا مصرعہ اول پہلے تھا "محبت ہے کبھرے ہیں جس میں جذبات" لیکن اب اس کی موجودہ حالت ہے۔
شعر نمبر ۴۹ کا مصرعہ اول پہلے یوں تھا "کشش سے دل اگر ہوتا نہ بے تاب" جس کو بعد میں تبدیل کر دیا گیا۔
شعر نمبر ۶۵ کا مصرعہ ثانی پہلے اس طرح تھا "مدد سے اس کے پرزوں میں روانی" جو بعد کو بدلا گیا۔
شعر نمبر ۷۰ کا مصرعہ ثانی پہلے "عداوت ہے عداوت ہے عداوت" لیکن چھپنے کے بعد اُسے بدل دیا گیا۔
شعر نمبر ۹۵ کا مصرعہ ثانی پہلے یوں تھا "بڑھاتی کون ہے اس کو حضوری" جو بعد میں تبدیل کیا گیا

اردو ادب میں اس نظم کو جو مقام حاصل ہو چکا ہے وہ اس عنوان پر کسی دوسری نظم کو نہ مل سکا۔ شاعر کا مشاہدہ کتنا وسیع اور گہرا ہے۔ اس کی نظروں سے کوئی پہلو ایسا نہیں گذرا جس میں محبت کی حکمرانی نہ ہو۔ اس محبت کا نام مختلف جگہوں پر اپنے ماحول اور اثر کی بنا پر مختلف ہو سکتا ہے لیکن جو قوت وہاں کارفرما ہے وہ یہی ہے۔ شاعر نے بڑی سادگی کے ساتھ لیکن پر اثر انداز میں اپنا نظریہ پیش کیا ہے۔ کسی بھی مکتبہ خیال کا انسان کیوں نہ ہو اُس پر اس نظم کا اثر ہونا لازمی ہے۔

سید زائر حسین کاظمی

اگر بتی

قبرِ غالب پہ جو سلگی تھی اگر کی بتی
دستِ محبوب سے صد شکر وہ مجھ تک پہونچی

جسم پر اپنے ملے خاکِ مزارِ غالب
نازپروردۂ دامانِ غبارِ غالب

رختِ زربفت، نہ ملبوسِ زری پہنے ہوئے
سادہ سا ایک لباس اگرئی پہنے ہوئے

رنگ خاکستری، جامہ دلِ بیدل ماتم
دوش پر شالِ عزا، خاک بسر، پشت میں خم

دیکھنے میں تنِ عاشق کی طرح زار و نزار
سونگھنے میں صفتِ مشکِ غزالانِ تتار

نکہتِ زلفِ جہاں گرد وہ خوشبو اُس میں
تارِ سنبل سے نہ کچھ فرق سرِ مو اس میں

زیبِ تن پیرہنِ سبز یہ خاکی وہ لباس
جس کی پیراہنِ یوسف ہی سے ملتی بُو باس

صورتِ شمعِ لحد کشتۂ غم، سوختہ سر
صاف اُترے ہوئے چہرے سے عیاں سوزِ جگر

جل کے حاشا نہ کبھی گورِ غریباں میں بجھی
آگ دامن میں لگی جب، تو گریباں میں بجھی

میں نے اس کو جو اسیرِ غمِ دوراں دیکھا
یعنی اپنی ہی طرح سوختہ ساماں دیکھا

پا کے دل سوز ہوا رازِ درون کا جویا
فیضِ روحانیِ غالب سے ہوئی وہ گویا

کہ میں اک رشتۂ دل ریشِ نیستاں ہوں صفی
رگِ گُل ہوں نہ رگِ سنبل و ریحاں ہوں صفی

گو بظاہر خسِ ناچیز و محقر ہوں میں
شعرا کی رگِ دل کے لیے نشتر ہوں میں

ہوں سراپا جو معطر صفتِ صندل و عود
فیضِ صحبت نے کیا ہے مجھے عنبر آلود

دست بوسی کے شرف پر ہے مرا دل نازاں
میں کہاں ورنہ، کہاں راجہ امیر احمد خاں

جذب کر کے اثرِ خُلقِ امیرِ خوش خُو
عطر پرور وہ ہمہ تن ہوں صفتِ دستنبو

شمع کا سوز اگر مجھ میں تو ہے گُل کی شمیم
خوش گوارا ایسی نہ ہوگی کبھی سنبل کی نسیم

ہر ہوا خواہ مجھے لیکے جلا دیتا ہے
کہ مرا دودِ جگر بُوئے وفا دیتا ہے

ابھی میں مرقدِ غالب پہ گئی تھی اک روز
پردۂ ساز میں پوشیدہ جو تھی گرمیِ سوز

سوز آغاز کیا تھا کہ بچھائی گئی میں
لَے زہے بخت کہ سوغات بنائی گئی میں

قبرِ غالب سے اٹھی جب تو اترے کے اٹھی
سوزِ دل لے کے اٹھی، سوزِ جگر لے کے اٹھی

کون سا دل نہ اسے دیکھ کے ہوگا غم ناک
ہے جہاں نقش کہ ہے گنجِ معانی تہِ خاک"

ہائے وہ پیکرِ اخلاص و وفا، جانِ سخن
اہلِ معنی کے لیے کعبۂ ایمانِ سخن

گو وہ خورشیدِ جہاں تاب ہے آنکھوں سے نہاں
پر ضیا بار شعاعوں سے منور ہے جہاں

معترف اس کی ہے خود بینشِ اربابِ نظر
چاند تو ڈوب گیا چاندنی پھیلی ہے مگر

سن لیں آوازہ، اسے ایک نظر دیکھ لیں آہ
جنتِ گوش یہی ہے، یہی فردوسِ نگاہ

لیکن افسوس کسی طرح یہ ممکن ہی نہیں
ہم ہیں بالائے زمیں اور وہ ہے زیرِ زمیں

کچھ خبر ہے تجھے کیوں قبر کے سونے والے
تجھ کو رو جاتے ہیں آ کر ترے رونے والے

سرگذشت اپنی سنا طاقتِ گفتار جو ہو
دلِ بیدار ترا محرمِ اسرار جو ہو

تیری صہبائے سخن کے یہ خریدار ہیں سب
تیری مستانہ اداؤں کے پرستار ہیں سب

تیرے مرقد کی زیارت کے لیے آئے ہیں
شرفِ کسبِ سعادت کے لیے آئے ہیں

ابھی پردے میں خموشی کے یہی چرچا تھا
کان میں آئی لبِ گور سے ناگاہ صدا

خوش رہو پھول عقیدت کے چڑھانے والو
قبر پر شمع و بخورات جلانے والو

یہ نشانی بھی نہ ہوتی تو کہو کیا کرتے
اشکِ حسرت کو کہاں ناصیہ فرسا کرتے

لہ راجہ امیر احمد خاں والیٔ محمود آباد تھے جن کا انتقال ۱۹۷۳ء میں لندن میں ہوا۔ مولانا صفی راجہ صاحب کے بڑے مداح تھے۔ اور راجہ صاحب بھی مولانا صفی کی بڑی قدر کرتے تھے۔

سید زائر حسین کاظمی

تاروں بھری رات

نظر کے سامنے ہے اک طلسمات
تری کیا بات اے تاروں بھری رات

ستارے ہیں کہ نازک آب گینے
رواں یا بحرِ اخضر میں سفینے

یہ انجم یہ فضائے چرخِ اخضر
سمندر میں بطیں جیسے شناور

ستارے جن کے ہر سو غلغلے ہیں
یہ سب بحرِ فنا کے بلبلے ہیں

ثبات اِن کو نہیں دنیا میں زنہار
یہ جتنے ہیں ثوابت و سیّار

جو اِن کی گردشوں پر کیجیے غور
ہر اک کا ان میں ہے محدود ہے دَور

لبوں پر ہے تحیّر کا ترانہ
کسی کا ہے یہ دہر آئینہ خانہ

خدا جانے سرِ منزل کہاں ہے
رواں دن رات یونہی کارواں ہے

فلک ہے یا کوئی لوحِ زبرجد
مرصّع کاریاں جس پر ہیں بے حد

کواکب ہیں کہ نگ چھوٹے بڑے ہیں
یہ ہیرے دستِ قدرت نے جڑے ہیں

نہ جانے توڑ کر اک سلکِ گوہر
کیے ہیں کس نے یہ موتی نچھاور

یہ کس کا جلوہ یارب گل فشاں ہے
کہ با انداز فرش کہکشاں ہے

فلک پر جمع ہیں جنت کی حوریں
زمیں کے رہنے والے کیوں نہ گھوریں

نکلے ہیں پردۂ شب میں ستارے
نشاط انگیز ہیں دلکش نظارے

کسی کے سیج پر بکھرے اُدھر پھول
تڑپ اٹھا اِدھر دل حسبِ معمول

کبھی اِس خندۂ دنداں نما پر
گہر افشاں مسلسل دیدۂ تر

جراحت خیز صحنِ باغِ گردوں
جوابِ سینۂ پُر داغ گردوں

بساطِ چرخ پر تارے بچھے ہیں
کہ خاکستر پہ انگارے بچھے ہیں

ہے اندیشہ یہی آہ رسا سے — دہک اُٹھیں نہ یہ اخگر ہوا سے
بجا عقد ثریا کو گلہ ہے — کہ پہلو میں دل پُر آبلہ ہے
بنات النعش اٹھائے داغ تازہ — لیے ہیں اپنے کاندھے پر جنازہ
خدا ہی جانتا ہے راز ہستی — وہ ہو انجام یا آغاز ہستی
ہوئے ہیں جس طرح سے خلق اختر — کھُلے وہ عقدۂ سربستہ کیونکر
جو ہے دل میں کہو کہہ دوں "صفی" میں — یہ شمعیں جس لیے روشن ہوئی ہیں

کریں تا اُن مزاروں پر چراغاں
نہیں جن کا جہاں میں کوئی پرساں

نوٹ:۔ صفی لکھنوی کے عہد میں نیچرل شاعری کی جانب شعراء کا جھکاؤ زیادہ ہو گیا تھا۔ ہر شاعر قدرتی مناظر حتی الامکان نظم کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ اسی لیے یہ دور نظم نگاری کے نقطۂ نظر سے زیادہ کامیاب رہا۔ جوش، چکبست، ملّا وغیرہ نے اس طرف زیادہ زور دیا۔ صفی لکھنوی تو اس فن کے بادشاہ ہی تھے۔ انھوں نے لال و جواہر اگلنا شروع کر دیے ان کی قومی نظمیں شاہکار ہیں جن میں قدرتی مناظر نہایت دلکش اور پر اثر انداز میں پیش کیے گئے ہیں۔ یہ نظم بھی اُسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔

سید زائر حسین کاظمی

تتلی

تتلی! اے جامہ زیب تتلی! — خوش رنگ نظر فریب تیلی!
ننھی سی جان، پیاری تتلی! — نیلی، پیلی، سفید، چتلی
تو حورِ جناں کی پنکھیاں ہے — یا پھول، پنکھڑی ہے، کیا ہے
نازک نازک ترے یہ بازو — یا شوخیِ حسن کی ترازو
اڑتی پھرتی ہے باغ بھر میں — چپّہ چپّہ تری نظر میں
رُمنہ ترا ہے سبزہ، و گل — قبضے میں ترے ہے جُزو تا کُل
تو پہلے تھی اک ذلیل کیڑا — ہمت کا مگر اُٹھا کے بیڑا
طے کر کے منازلِ کثافت — پہونچی تا سرحدِ لطافت
تیری ہر وضع اب ہے دلکش — ہو سادہ لباس یا منقش

قدرت کی یہ فیض گستری ہے — کیڑا جو تھا اب وہی پری ہے
پرواز میں اس قدر تُنک سیر — ہمتا جس کا نہیں کوئی طیر

کچھ شرط سہی اُڑے بھنبھیری — بازی میں رہے گی تو ہی میری
گل کے سرِ دوش تو جو چڑھ جائے — حسن اس کا چمن میں اور بڑھ جائے
تو شاخ سے جب اڑے بصد ناز — سمجھیں سب گل ہے گرم پرواز

گوناگوں تتلیوں کی بُہتات — کب ہوتی ہے؟ خوب جب ہو برسات
اُن کے افسانے ہیں نرالے — یہ بھی کہتے ہیں کہنے والے

ہیں بھیس میں تتلیوں کے رد جیں
معروف بہار دیکھنے میں

رو جیں آزاد کی ہوئی ہیں
اِن کو نہ چھوؤ چھوئی موئی ہیں

دیکھو یہ دیکھنے کی ہیں چیز
چھونا اِن کا خلاف تمیز

کرتے ہو اگر پسند بچو!
مٹھی میں کرو نہ بند بچو!

نہ اِن پریوں کو جان سے مارو
آہستہ سے شیشے میں اتارو

جس میں کہ بھری ہوئی ہو کچھ دُوب
یعنی اُن کی غذائے مرغوب

یہ عمر بسر کریں مع الخیر
تم شوق سے بیٹھ کر کرو سیر

راحت سے جو چاہتے ہو رہنا
مانو اپنے صفی کا کہنا

اُن جانوروں کو دو نہ ایذا
تم کو دیتے ہوں جو نہ ایذا

نوٹ:- یہ نظم دیا نرائن نگم، ایڈیٹر "زمانہ" کا نپور کی فرمائش پر کہی گئی تھی جس کو زمانہ کی سلور جبلی نمبر فروری سنہ ۱۹۲۹ء میں شامل کیا گیا تھا۔ (دیکھیے زمانہ سلور جبلی نمبر کا صفحہ ۱۶۷ اور ۱۶۸)

سید زائر حسین کاظمی

قطعۂ دعائیہ

"زمانہ" جسے جانتا ہے زمانہ — کہ حسنِ ادب کا ہے آئینہ خانہ
نکلتا ہے اب جوبلی نمبر اس کا — ترانہ گائے کا زمانہ یگانہ
ہے پچیسویں سال اک جشنِ عشرت — نئے کلک سے موجزن شادیانہ
غنیمت ہے دورِ فلک میں غنیمت — جو ہاتھ آئے بہرِ مسرت بہانہ
یہ صوبے کا ہے مایۂ ناز پرچہ — ترانہ ہر اک اس کا دلکش ترانہ
مبارک اسے روز افزوں ترقی — کہ اردو ادب کا ہے نادر خزانہ
نگم ہیں مدیر سخن سنج اس کے — روشِ ابتدا سے وہی مخلصانہ
الٰہی رہے عطر بیزِ معانی — یہ زلفِ پریشاں اردو کا شانہ
اک اعجاز اس کی دل آویز نظمیں — اک افسوں ہے اس کا ہر اک فسانہ
مسلمان ہندو بھی خواہ دونوں — ابھی تک معاون ہیں شانہ بشانہ

صفی صدقِ دل سے دعا ہے یہ میری
زمانہ رہے قدردانِ "زمانہ"

نوٹ:۔ "زمانہ" ماہنامہ رسالہ کانپور سے نکلتا تھا جس کے ایڈیٹر دیانرائن نگم مرحوم تھے۔ فروری ۱۹۲۸ء میں اس رسالے کا جبلی نمبر جاری کیا گیا تھا جس کے لیے صفی لکھنوی نے یہ قطعہ نظم کیا تھا۔ اس سلور جبلی نمبر کا آغاز ہی اسی قطعہ سے ہوتا ہے جیسا کہ دیانرائن نگم اپنی پیش گفت میں لکھتے ہیں

"اس نمبر کا آغاز فخر شعرائے حال مولانا صفی کے دعائیہ قطعہ، فخر ہندوستان سر راجندر ناتھ ٹیگور، محبِ ملک مسٹر اینڈریوز، نامور وزیر تعلیم صوبۂ متحدہ۔ قابل ناظم تعلیمات صوبہ کے پیام محبت سے ہوا ہے۔ ہم ان عالی مرتبہ محسنوں کے محبت آمیز خیالات و جذبات کو اس نمبر میں تبرکاً شائع کر رہے ہیں۔"

سید زائر حسین کاظمی

تضمین اشعار قطعہ بند حضرت میرؔ علیہ الرحمہ

درسِ عبرت

بندِ اوّل

دنیائے دہر جس کو سمجھتے ہیں مقبرہ — زندانِ تنگ ہے وہ اسیرانِ خاک کا
دشتِ فنا کی منزلِ اوّل ہے یہ مقام — سوئے عدم یہیں سے ہے اک راستہ گیا
ٹھہرے ہوئے ہیں قافلے کے قافلے یہاں — اور ان مسافروں کی نہیں کوئی انتہا
کل تک انھیں سر آنکھوں پہ دیتے تھے تم جگہ — قبروں کو جن کی روندتے ہو آج زیرِ پا
مہرِ سکوت اُن کے لبوں پر لگی ہوئی — جتنا پکاریئے نہیں آتی کوئی صدا
سب ایک ہی لباس میں اور ایک وضع میں — کوئی نہ بادشاہ نہ ان میں کوئی گدا
ایسا کیا ہے گردشِ گردوں نے پائمال — ہے کون کس دماغ کا یہ بھی نہیں پتا
اک ساتھ رہ کے بھی ہیں اکیلے یہ سب کے سب — ظاہر میں متحد ہیں، بباطن مگر جدا
مثلِ مکیں مکاں بھی سراسر شکستہ حال — یوں کہنگی نے رخنہ گری کی ہے جا بجا
قبریں بلند و پست کوئی پختہ کوئی خام — اس میں شگاف اس میں گڑھا اک پڑا ہوا
ہے کون پردہ پوشِ عیوبِ شکست و ریخت — قبروں پہ اُن کی سبزۂ خوابیدہ کے سوا
کرتی ہے گاہ گاہ شبِ ماہ روشنی — اِن بیکسوں کو شمع سے کیا ورنہ واسطا
بھولے سے فاتحہ کو بھی آتا نہیں کوئی — ناآشنا وہ آج ہیں کل تھے جو آشنا
اے دورِ انقلابِ زمانہ سے بے خبر — کنجِ لحد کو تو نہ سمجھ عافیت سرا
عبرت کا واقعہ ہے ذرا اس سے لے سبق — "کل پاؤں ایک کاسۂ سر پر جو آگیا
"یکسر وہ استخوانِ شکستہ سے چور تھا"

بند دوم

ہاں سرخوشانِ دولت و اقبال و کرّ و فر / انجام کار پر بھی کبھی چاہیے نظر
ہر شخص کو وہ خواہ کسی منزلت کا ہو / درپیش ایک دن ہے یہی آخری سفر
شیرازہ بندِ جلدِ بدن رشتۂ حیات / ٹوٹا جہاں تو ہوں گے کل اجزا اتر بتر
سمجھے گا کون کلّہ بوسیدہ دیکھ کے / یہ سر کسی گدا کا ہے یا فرقِ تاجور
اِس چند روزہ زیست پہ بیجا ہے کبر و ناز / ہر ذی حیات کو نہیں جب موت سے مفر
پھر خاک میں ملے گا جو پیدا ہے خاک سے / مبدأ حیات کا بھی یہی ہے یہی مَقر
رہرو سرا میں آ کے ٹھہرتا ہے جس طرح / اس دارِ بے ثبات میں کر عمر یوں بسر
طرزِ سلوک بے ہمہ و با ہمہ رہے / امکان بھر کسی کو نہ پہونچے کوئی ضرر
ابنائے روزگار سے دورِ حیات میں / حُسنِ عمل وہ ہو جو دلوں پر کرے اثر
تمغہ تجھے ملے گا بقائے دوام کا / خدمت پہ بے کسوں کی اگر باندھ لے کمر
دولت وہی ہے جس سے ہوں جاری اُمورِ خیر / بدتر خزف سے ورنہ ہے گنجینۂ گہر
اصلاحِ نفس کے لیے انساں کے واسطے / مضمونِ بے ثباتیِ دنیا ہے خوب تر
الحق جنابِ میرؔ کے اشعار قطعہ بند / عبرت کا ایک آئینہ ہیں بہرِ دیدہ ور
ہے سرگذشتِ کاسۂ سر گو کہ دلخراش / اک وعظ و پند ہے اُسے سُن لیجیے اگر
جب پائے میرؔ کاسۂ سر پر پڑا صفیؔ / "کہنے لگا کہ دیکھ کے چل راہِ بے خبر"
"میں بھی کبھی کسو کا سرِ پُرغرور تھا"

نوٹ:۔ یہ تضمین صفیؔ لکھنوی نے سنہ ۱۹۴۷ء میں میر تقی میرؔ کے مشہور قطعہ بند سے

کل پاؤں ایک کاسۂ سر پر جو آ گیا / یکسر وہ استخوانِ شکستہ سے چُور تھا
کہنے لگا کہ دیکھ کے چل راہ بے خبر / میں بھی کبھی کسو کا سرِ پُرغرور تھا

پر نظم کہی تھی ۱۹۴۷ء میں صفی لکھنوی کی عیادت کے لیے پروفیسر سید مسعود حسن رضوی ادیب مرحوم گئے۔ صفی لکھنوی نے پروفیسر ادیب کو یہ تضمین سنائی اور داد چاہی پروفیسر صاحب نے سن کر خلاقاً تعریف تو کی لیکن دل ہی دل میں افسوس کیا کہ وہ صفی جو آل انڈیا شیعہ کانفرنس کے جلسوں میں ڈائس پر ٹہل ٹہل کر ایسی نظم کہہ دیتا تھا کہ جس کا جواب ممکن نہیں۔ آج وہی صفی اس گھِسی پِٹی تضمین پر فخر کے ساتھ طالب تحسین ہے۔

(یہ واقعہ پروفیسر صاحب نے ایک دن بہ سبیل تذکرہ مجھ سے بیان کیا تھا) اس کے بعد کئی بار میں نے یہ تضمین غور سے پڑھی لیکن کوئی شعری یا ادبی کمی مجھے نظر نہ آئی۔ بلکہ اس تضمین میں شاعرانہ پہلو اور نمایاں طور پر سامنے آجاتا ہے۔ اس تضمین پر الگ سے ایک مضمون پیش خدمت کیا جائے گا۔

سید زائر حسین کاظمی

ہفت خوانِ اُردو

(مولانا صفی نے اُردو کی مختصر واقعاتی تاریخ "ہفت خوان اردو" کے نام سے نظم کی ہے جس میں مختلف زمانے کی شاعری کے نمونے دکھا کر آخر میں موجودہ دور کے شعرا کی حالت کا جو نقشہ کھینچا ہے وہ ناظرین کی ضیافت کے لیے پیش ہے۔)

غدر کے قبل کی تصنیف ہے گلزارِ نسیم
ویسے دس شعر تو کہہ دے کوئی اب ہو کہ سلیم

یہ تو ہم کو رسوادوں کی لیاقت کا ہے حال
کہتے ہیں جن کے مگر تذکرۂ اہلِ کمال

نہیں جی، اُن سے تو ہم لوگ کہیں ہیں بہتر
شاعری کرتے ہیں گلزار و دبستاں پڑھ کر

طوطیِ آئینہ طبعِ خداداد ہیں ہم
وضع ترکیب میں غالب کے بھی استاد ہیں ہم

کون ضائع کرے ان باتوں میں اپنی اوقات
فاعلاتن۔ فعلاتن۔ فعلاتن۔ فعلات

انگریزی کی طرف دل کو جو رغبت ہے زیاد
کی ہے کچھ لوگوں نے یورپین اردو ایجاد

انگریزی کو کھپاتے ہیں بعینہٖ اس طرح
گفتگو کرتے ہیں اُردو میں فرنگی جس طرح

صرف بازیچۂ طفلاں صفت گل اُردو
ہے ترقی کی عوض رُو بہ تنزل اُردو

تانتا ہے کوئی بیدرد کوئی دھونستا ہے
دیوبانی کوئی۔ کوئی عربی ٹھونستا ہے

فارسی رنگ میں دیتا ہے کوئی ڈوب اس کو
کیا آشفتہ خیالوں نے پر آشوب اس کو

منچلوں نے پئے تخریب کمر باندھی ہے
نقش اُردو کے مٹانے میں ہر اک تدھی ہے

کوئی بنتا ہے خدا، خالقِ جذبات کوئی
آدمیت سے تو کرتا ہی نہیں بات کوئی

گو کسی کو بھی نہیں مشقِ سخن گوئی کچھ
کوئی کچھ، کوئی ہے کچھ کوئی ہے کچھ، کوئی کچھ

آج کل فرض سمجھتے ہیں سخن سنج احباب
نام کے ساتھ ہو خود ساختہ اک اک خطاب

ہمہ دانست میں سب جتنے بھی سخن گستر ہیں
نثر میں نظم میں غالب سے کہیں بہتر ہیں

ہاتھ میں سب کے ہے اُردوئے معلیٰ کا نشاں
منہ میں رکھتے ہیں زباں اس لیے ہیں اہلِ زباں

کوئی مقیاس معین ہے نہ کوئی معیار
صاحبِ طرز ہے ہر ایک پریشاں گفتار

بے تمیزی کا یہ طوفان جہاں برپا ہو
کیسے اُس ملک میں اُردو کو ترقی کیا ہو

ورنہ ہندی ہی زباں کا ہے یہ اُردو جوہر
گھونٹ کر کھانڈ کو جس طرح بناتے ہیں شکر

اس دل آویز زباں کے کلمات و امثال
دونوں قوموں کے قدیمانہ مراسم پر ہیں دال

ہندوؤں اور مسلمانوں کا ہے فرض یہی
مل کے اُردو کو بنائیں وہ زبانِ ملکی

اس کی اصلاح میں دونوں ہوں دل و جاں سے شریک
بگڑے جس وقت زباں مل کے بنائیں اُسے ٹھیک

ملک میں ہندی و اُردو کی لڑائی کیسی
بہنیں بہنیں ہیں یہ اپنی وہ پرائی کیسی

دونوں مل جل کے رہیں خون کریں کیوں پانی
اس سے کیا گر کوئی شہری ہے کوئی دہقانی

ہم مذاقی کی جھلک دونوں کے افعال میں ہے
ہے جو کچھ فرق تو چہرے کے خط و خال میں ہے

بحث بے سود ہے یہ حرف ہو وہ حرف نہ ہو
حرف کوئی ہو مگر وقت بہت صرف نہ ہو

اس زمانہ میں جب اُردو سے ہیں اکثر بیزار
قابلِ دید ہیں چکبست و نظر کے اشعار

دیکھِ افسانہ تو بس ہیں پریمی انداز
شستہ و رفتہ زباں جس پہ زمانے کو ہے ناز

کشتِ اُردو عربی کی ہے نہ ایرانی کی
پھر عبث شاخ لگاتے ہیں مسلمانی کی

قابل اللہ کرے اب ہمت سرکار نظام
واقعاً آصف سابع نے کیا ہے وہ کام

یعنی اُردو کی زباں ہوگی زبانِ علمی
اس کہاوے کو بنائیں گے کمانِ علمی

بعض ہندی کو بتاتے ہیں زبانِ علمی
اس ذخیرے سے کبھی اُردو کو مدد پہونچے گی

کیونکہ ہم لوگ تعصب سے اگر کام نہ لیں
ہندی اُردو کی رقابت کا کہیں نام نہ لیں

دیس کی دونوں زبانیں ہیں کوئی فرق نہیں
کیوں جلیں ان سے یہ شعلہ نہیں وہ برق نہیں

متحد ہو کے یہ دونو ہیں اسی طرح جدا
بہہ نکلتا ہے کہیں جھیل سے جیسے دریا

ہوں گی سیراب زبانیں بہ طفیلِ اُردو
خس و خاشاک سے رکتی نہیں سیلِ اُردو

پیامِ مسرت

۲۲ر اپریل ۱۹۳۶ء کو ایڈیٹر زمانہ کے تیسرے فرزند جناب شیام نرائن نگم ایم اے ڈپٹی کلکٹر رائے بریلی کی شادی ہوئی۔ اس تقریب کا نوید حضرت صفیؔ لکھنوی کو پیش کیا گیا۔ موصوف خود تو تشریف نہ لے جا سکے لیکن ازرادِ لطف و کرم قلم برداشتہ یہ مختصر سی تہنیتی نظم لکھ کر بھیج دی تھی۔

سید زائر حسین کاظمی

محترمی نقادِ یگانہ زیب دہِ اوراقِ زمانہ
خط نے دیا پیغامِ مسرت خط ہے یا اک جامِ مسرت
غنچۂ دل کو خط ہے یہ شبنم قلبِ صفیؔ ہے تازہ و خرم
تہنیتی جو لکھنا تھا نامہ لکھے شعر اٹھا کر خامہ
بیٹے کی شادی ہو مبارک خانہ آبادی ہو مبارک
بجیے شوق سے عشرت خانہ گانے والے گائیں ترانہ
چاند سا مکھڑا پھول سا چہرہ شیام نرائن باندھے سہرا

سلام و نوحے

لسان القوم سید علی نقی صفی لکھنوی نے اپنے سلاموں کو فل اسکیپ سائز کاغذ پر بہت ہی خوشخط ڈھنگ سے نقل کروایا تھا۔ جس کے صرف بارہ ورق مجھے مل سکے۔ یہ سلام صفی لکھنوی کے ایک عزیز شاگرد مرزا کاظم علی قمر لکھنوی مرحوم نے مجھے عنایت فرمائے تھے۔ اس میں کل ۱۰ سلام اور ایک واقعہ ہے، ایک سلام مجھے اور مل گیا وہ بھی اس میں درج کر دیا گیا ہے۔ انھیں اوراق کے ایک صفحہ پر پنسل سے "صحیفۃ العزا" لکھا ہوا ہے۔ جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ صفی لکھنوی اپنے سلاموں اور نوحوں کے مجموعہ کا نام "صحیفۃ العزا" رکھ چکے تھے اور اسی نام سے انھیں چھپوانا چاہتے تھے، لیکن یہ حوصلہ پورا نہ ہو سکا۔ یہ اردو ادب کی بدنصیبی ہے کہ صفی جیسے قادر الکلام شاعر کا کلام بھی محفوظ نہ رہ سکا۔ اس لیے انھیں سلاموں پر اکتفا کرتے ہوئے ان کو اس کتاب میں جگہ دی گئی ہے۔

سید زائر حسین کاظمی

سلام

ہم اہلِ عزا سے ہے ملاتا اگر آنکھیں — اچھا پھر اُدھر ابرِ سیہ ہے اِدھر آنکھیں
لطفِ غمِ شہ سے ہوئیں کیا بے خطر آنکھیں — حوروں سے ہیں لڑتی درِ فردوس پر آنکھیں
ہوتی ہیں غمِ سبطِ نبی میں جو تر آنکھیں — کرتی ہیں دلِ حیدر و زہرا میں گھر آنکھیں
خاکِ درِ شہ رکھتی ہیں مدِ نظر آنکھیں — ہو کحلِ جواہر تو نہ دیکھیں اُدھر آنکھیں
پیری میں جو ہیں غم سے جوانی کی تر آنکھیں — بے نور ہیں مانندِ چراغِ سحر آنکھیں
لائی ہیں تماشا گہہ ہستی میں عدم سے — لیجاتی ہیں اب دیکھیے ہم کو کدھر آنکھیں

پیری ہے جوانی گئی ہشیار ہو غافل — دھوپ آگئی سر پر نہیں کھلتیں مگر آنکھیں
رو لیں شہِ بیکس کی غریب الوطنی پر — دنیا سے چلیں لے کے یہ زادِ سفر آنکھیں
مشتاقِ لقائے رخِ محبوبِ خدا ہیں — گستاخ ہوئیں دیکھیے گا کس قدر آنکھیں
روشن ہوئیں مرقد پہ جو دیدارِ علی سے — ظلمت کو سمجھنے لگیں کحل البصر آنکھیں
تخمِ اشکِ غمِ شاہ کے ہو جائیں گے سرسبز — پائیں گی ریاضت کا جناں میں ثمر آنکھیں
اشکِ غمِ شبیر ہے سرمایۂ بخشش — بیعانۂ جنت میں یہ دیں گی گہر آنکھیں
مژگانِ سیہ پوش بچھا کر صفتِ ماتم — کہتی ہیں غمِ شاہ کریں عمر بھر آنکھیں
ہر جنبشِ مژگاں سے عیاں سینہ زنی ہے — دن شاہ کے ماتم میں ہیں کرتی بسر آنکھیں
رن صاف نظر آیا ہرن ہو گئے بزدل — شیرِ اسد اللہ نے دکھائیں جدھر آنکھیں
حیران تھے عدو صاعقۂ تیغِ علی سے — ہر چار طرف ڈھونڈ رہی تھیں مفر آنکھیں
گردِ سمِ دلدل سے جو کی راہ میں شوخی — ملتی ہوئی آئے گی نسیمِ سحر آنکھیں
نظروں پہ چڑھا ہے یہ غبارِ رہِ دلدل — مرنے سے کھٹکتی ہیں مری بیشتر آنکھیں
جاروب کشِ روضۂ نورانیِ شہ کی — ہو جاتی ہیں آلودۂ گردِ نظر آنکھیں
پیاسوں کا سنا حال جو موجوں کی زبانی — حیران ہے حبابِ لبِ جو کھول کر آنکھیں
تابوتِ شہِ دیں کے تصور میں یہ روئیں — بادامِ سیہ بن گئی ہیں سوکھ کر آنکھیں
سجاد کو تھی آبلہ پائی سے جو تکلیف — کرتے تھے ملک فرشِ سرِ رہ گذر آنکھیں
زنداں میں اسیروں پہ عجب وقت پڑا تھا — دکھلاتا تھا ہر حلقۂ زنجیرِ در آنکھیں
ماں کہتی تھی یادِ علی اصغر میں یہ رو کر — آ ڈھونڈ رہی ہیں تجھے نورِ نظر آنکھیں
بچنے کی نہ تھی عابدِ بیمار کو امید — چھت سے جو لگی رہتی تھیں آٹھوں پہر آنکھیں
بیمار ہی بیمار کی حالت ہے سمجھتا — حالِ دلِ سجاد سے تھیں باخبر آنکھیں

کوتہ نظروں کے لیے سرمہ ہے یہ تحریر
اشعارِ صفی دیکھیں ذرا کھول کر آنکھیں

سلام

کشائش عقدۂ دل کی طلب کر دستِ حیدر سے
کھلے گا قفل اس در کا کلیدِ بابِ خیبر سے

خدا کے حفظ میں رہوں دورِ جامِ مدحِ حیدر سے
حصارِ عافیت کھینچا ہے میں نے خطِ ساغر سے

سخن میں رنگ ہے وصفِ لبِ شبیر و شبر سے
بھرا ہے میرا پیمانہ مئے تسنیم و کوثر سے

بہ شفقت پیش آئے تلخ رو کیا اہلِ جوہر سے
نہ دھوئی بحر نے گردِ یتیمی رشتۂ گوہر سے

دلِ حیراں کو زینت دی ہے یادِ روئے اکبر سے
اس آئینے کی زیبائش ہے تصویرِ پیمبر سے

اشارے ہو رہے ہیں گلستانِ حبِ حیدر سے
بلاتی ہیں ہمیں اٹھ اٹھ کے موجیں حوضِ کوثر سے

ہے دل کو تازگی یادِ درِ دندانِ اکبر سے
نہالِ خشک کو سینچا ہے میں نے آبِ گوہر سے

فلک کا ہے یہی مقصد زمیں کے گرد چکر سے
مشرف ہو طوافِ روضۂ سبطِ پیمبر سے

شہیدوں کے لیے آنسو اگر برسے تو کیا برسے
مناسب ہے بہے دریا لہو کا دیدۂ تر سے

ملی تھی سربلندی دستِ عباسِ دلاور سے
نشانِ سبز کیونکر جھک کے ملتا چرخِ اخضر سے

صفِ مژگاں نہیں پرنم سرشکِ دیدۂ تر سے
پرا حوروں کا نکلا ہے نہا کر حوضِ کوثر سے

فقیرِ پاک مشرب ہوں غدیرِ خم ہے خمخانہ
مئے کوثر کی بو آتی ہے میرے کاسۂ سر سے

فلک نے جن کو دستور العمل اپنا بنایا ہے
وہ چند اوراق ہیں خارج مرے عصیاں کے دفتر سے

درِ جنت پہ روکا مجھ سیہ رو کو تو کہہ دوں گا
غلام اک میں بھی ہوں تم پوچھ لو آقائے قنبر سے

بہا جب اشکِ مومن بحرِ رحمت جوش میں آیا
زیادہ تر ہے طوفاں خیز یہ قطرہ سمندر سے

نہیں بندہ کوئی ایسا خدائی میں جسے شک ہو
نصیری کے خدا کا مرتبہ پوچھے پیمبر سے

کٹے تھے بال و پر جبریل کیا پرواز کر سکتے
اگر قوت نہ آ جاتی نویدِ فتحِ خیبر سے

سوادِ سرمۂ خاکِ نجف سے تھی جو نورانی
نہ جھپکی آنکھ اپنی آفتابِ صبحِ محشر سے

زمینِ کربلا سے خاک خوں آلودہ ہو نکلی تھی
مدینے تک ہوائے جنبشِ بالِ کبوتر سے

غبار دل نکل کر ہوگیا تھا مجتمع اتنا
کہ سانس آئی تو اٹھی گرد غم عابد کے بستر سے

رہا اک عمر ماتم کربلا کے بھوکے پیاسوں کا
دھواں اٹھا نہ برسوں خانۂ آل پیمبر سے

یہ مومن نذر اسی پیاسے کی دلواتے ہیں شربت پر
ہوا لبریز جام عمر جس کا آب خنجر سے

لب کوثر علی کو آنکھ سے دیکھو تو دل خوش ہو
شراب جلوہ ساقی بھریں شیشے میں ساغر سے

یہی اے آسماں تیمارداری ہے مریضوں کی
لٹایا تھا زمیں پر کھینچکر عابد کو بستر سے

علی سا لعل پاکر فاطمہ بنت اسد بولیں
یہ دولت ہاتھ آئی ہے مجھے اللہ کے گھر سے

قدم بھی جس جگہ ارباب ہمت رکھ نہیں سکتے
شہید کربلا نے طے کیا وہ مرحلہ سر سے

صفی ناحق گلہ سب سے فلک کی سخت گیری کا
یہ قصہ ہوگا فیصل قاضی باز و کبوتر سے

سلام

ذوق ثنائے شہ مرے ہر جزو تن میں ہے
گویا زباں ہے ہر بن مو جو بدن میں ہے

بے حد ہے اجر دیدۂ مومن کے اشک کا
جو ہے وہ در بیش بہا اس عدن میں ہے

اکبر سے نوجواں کا ملا خاک میں شباب
اب تک یہ داغ سینۂ چرخ کہن میں ہے

غش آیا جس نے طشت میں دیکھا سر حسین
سمجھا یہی کہ شمع تجلی لگن میں ہے

تاب سہیل سے ہے ادیم یمن کو فیض
داغ حسین سینے میں خوشبو دہن میں ہے

شبنم ہے روضہ خوانی بلبل پہ اشکبار
تقریب ماتم گل زہرا چمن میں ہے

مدفن میں آ رہی ہے فرشتوں کو بوئے خلد
خاک شفا صفی جو ہمارے کفن میں ہے

سلام

ہاتھ میں میرے سلامی دامنِ شبیر ہے
اہلِ محشر کہہ رہے ہیں واہ کیا تقدیر ہے

سرمۂ چشمِ ملک خاکِ درِ شبیر ہے
مرتبے میں گرد اس کے رو برو اکسیر ہے

صفحۂ خاطر پہ نقشِ روضۂ شبیر ہے
کعبۂ دل میں ہمارے کربلا تعمیر ہے

صورتِ اکبر رسول اللہ کی تصویر ہے
نام بھی کیا نام ہے جو داخلِ تکبیر ہے

رو کشِ لعل و گہر ہر غیرتِ اکسیر ہے
ذرۂ خاکِ شفا خالِ رُخِ تاثیر ہے

روزِ قتل ادنٰی یہ صبرِ حضرتِ شبیر ہے
ہے زباں پر شکرِ حق گردن تہِ شمشیر ہے

شوقِ منصب ہے نہ دل کو خواہشِ جاگیر ہے
آرزوئے آستاں بوسیٔ درِ شبیر ہے

ظالمو! آہِ دلِ مظلوم پُر تاثیر ہے
عرشِ اعظم ہے نشانہ جس کا یہ وہ تیر ہے

لاکھ سر پٹکا کرے جو قائلِ تدبیر ہے
وہ نہ بدلے گا جو مضمونِ خطِ تقدیر ہے

آج غفلت میں خیالِ خام دامنگیر ہے
دیکھنا کل کیا خراب اس خواب کی تعبیر ہے

عالمِ امکاں وہ صحرائے تعلق ہے جہاں
ہر قدم خوار ہوس انساں کے دامنگیر ہے

نامۂ اعمالِ مردم جس سے ہوتے ہیں سیاہ
اس سیاہی سے رقم میرا خطِ تقدیر ہے

ہے سیہ کاری پہ میری چشمِ رحمت ملتفت
رو سیاہی کیا ہے اپنی سُرمۂ تسخیر ہے

خامہ فرسائی سے کیا حاصل کراماً کاتبین
تم جو لکھتے ہو وہ پیشانی پہ خود تحریر ہے

جو سنی روزِ الست ایسے مزے کی بات تھی
گوشِ دل اس وقت تک لذت کشِ تقریر ہے

سدِ راہِ منزلِ مقصود ہے خود جذبِ شوق
پیچ و تابِ دل ہمارے پاؤں کی زنجیر ہے

دیر میں ہوتا ہے حرفِ زود کو خاطر نشیں
کام میں تعجیلِ بے جا باعثِ تاخیر ہے

کیا کسی کے سامنے پھیلائیے دستِ طلب
شرم دامنگیر ہے ہمت گریباں گیر ہے

دے رہا ہے ساقیٔ کوثر ملا بھر بھر کے جام
زہے طوبیٰ مجمعِ مستانِ ساغر گیر ہے

کلکِ قدرت نے صدا دی کھینچکر شکلِ حبیب
دونوں عالم کے مرقع میں یہ اک تصویر ہے

صاف بن جاتا ہے کندن سانسِ قلبِ سیاہ
قطرۂ اشکِ غمِ شہ روغنِ اکسیر ہے

غیرتِ چرخِ چہارم ہے زمینِ کربلا
ذرّے ذرّے میں یہاں کے مہر کی تنویر ہے

آگ دوزخ کی انہی پانی سے ہو جاتی ہے سرد
بحرِ رحمت قطرۂ اشکِ غمِ شبیر ہے

شاہ فرماتے تھے پیاسا ہوں تو کہتے تھے لعیں
لیجیے حاضر یہاں آبِ دمِ شمشیر ہے

شہ سے بانو نے کہا دیکھو تو میرے لال کو
پھول سے چہرے کی رنگت پیاس میں تغیر ہے

قاصدِ صغرا سے بولے پڑھ کے خط بیکس امام
مر گئے وہ سب سلام اس میں جنھیں تحریر ہے

شاہ کہتے تھے رہیں قابو میں کیا قلب و جگر
غم جواں بیٹے کا رنجِ اصغرِ بے شیر ہے

لوگ کہتے تھے اسیرِ اہلِ حرم کو دیکھ کر
اہلِ بیتِ مصطفیٰ کی ہائے یہ توقیر ہے

کہتے تھے شہ پانی اصغر کو پلا دو ظالمو
ہوں اگر مجرم تو میں بچے کی کیا تقصیر ہے

یوں رجز خواں تھے حبیب ابن مظاہر وقتِ جنگ
غم نہیں قد میں یہ پیری سے خمِ شمشیر ہے

رو کے کہتے تھے ملک دیکھا نہیں جاتا یہ ظلم
کُند خنجر ہے خشک حلقِ حضرتِ شبیر ہے

کہتی تھی بیمار صغرا لیجیے بابا خبر
جاں بلب ہوں پھر مسیحائی میں کیوں تاخیر ہے

کہتے تھے عابد اٹھائے اب قدم اٹھتا نہیں
ناتواں ہیں پاؤں بھاری آہنی زنجیر ہے

راز کعبہ کی سیہ پوشی کا ظاہر ہو گیا
یعنی اب تک سوگوارِ حضرتِ شبیر ہے

کیا صفیؔ اس کی خطا جس میں نہ کچھ حس و نفس
غم نہیں حاسد جو ساکت صورتِ تصویر ہے

سلام

جو داغِ سبطِ رسالت مآب لے کے چلے
وہ تیرہ گور میں اک آفتاب لے کے چلے

اٹھے جہاں سے تو چشمِ پُر آب لے کے چلے
غمِ ثبات بشکلِ حباب لے کے چلے

لحد میں ہم دلِ پر اضطراب لیکے چلے
کہاں سے جان پر اپنی عذاب لیکے چلے

جب آنکھ بند ہوئی اپنی صبحِ پیری میں
غمِ درازیِ شبہائے خواب لیکے چلے

ملے گا ساقیِ کوثر سے اس کو جامِ شراب
جگر جو آتشِ غم سے کباب لیکے چلے

گرائے بیٹھ کے بزمِ عزائے شہ میں جو اشک
اُٹھے تو ہاتھ میں دُرِّ خوش آب لیکے چلے

یہاں جو روئے تو سب دھو گئی سیہ کاری
گناہ لائے تھے دیکھو ثواب لیکے چلے

اُدھر سے دستِ کرم رحمتِ خدا کا بڑھا
اِدھر مَلَک میری فردِ حساب لیکے چلے

پسِ فنا بھی گیا دل کے ساتھ داغِ حسینؑ (ق)
ولائے سبطِ رسالتمآب لیکے چلے

سنا جو تھا کہ لحد ہے مقامِ تیرہ و تار
بجائے شمع ہم اک آفتاب لیکے چلے

فدائے تشنہ دہانیِ حضرتِ عباس
لبِ فرات تمنائے آب لیکے چلے

نشانِ نعشِ پسر ڈھونڈھنے میں کوئی نہ تھا
کہ ساتھ اسے خلعتِ بوتراب لیکے چلے

یہی کلام تھا اُن سے کوئی ملا دے ہمیں
جو داغ دیکے چلے ہیں شباب لیکے چلے

ہوئے سوار جو شہ مڑ کے بیکسی سے کہا
جلو میں کہدے شہادت رکاب لیکے چلے

غش آرہا ہے محبانِ شہ کو ماتم میں
کہاں ہے خازنِ جنت گلاب لیکے چلے

حرم سے دیر میں لایا ہے اب صفیؔ دیکھیں
کہاں ہمیں دلِ خانہ خراب لیکے چلے

سلام

سلام اُس سیّدِ غربت وطن مذبوحِ خنجر پر
نہ اعدا نے جسے رہنے دیا قبرِ پیمبر پر

وہ میکش ہوں کہ جم کو رشک ہے جس کے مقدر پر
غلامِ ساقیِ کوثر قسم ہے میرے ساغر پر

نہیں گردن کشی زیبا بشر کو افسرِ زر پر
ہزاروں ٹھوکریں اک دن پڑیں گی کاسۂ سر پر

سوادِ نامۂ اعمال سے اپنے مجھے ڈر ہے
پڑے دھبّا نہ کوئی دامنِ صحرائے محشر پر

بلندی سطح آبِ بحر کی نسبت ہے ساحل میں
قناعت ہو تو مفلس کو ہے فوقیت تونگر پر

ہمیشہ خود بھی خارج سدِ بابِ خلق رہتا ہے
جگہ بیرونِ خانہ پائی ہے زنجیر نے در پر

علی کا رتبۂ اعلیٰ اسی سے صاف ظاہر ہے
قدم اللہ اکبر کعبے میں دوشِ پیمبر پر

اسی قرآں کا خط ہے وجہِ نازِ کاتبِ قدرت
نظر عینِ عبادت کیوں نہ ہو رخسارِ حیدر پر

رہا خالی سحر سے دوپہر تک روزہ افطار
تباہی آئی تھی کیسی محمد کے بھرے گھر پر

ہے مردودِ کفِ شاہِ قناعت پیشہ عالم میں
اسی خجلت سے زردی چھا گئی ہے چہرۂ زر پر

نہ تھا پانی جو سرو تربتِ بے شیر پر چھڑکیں
زمیں تر ہو گئی روئے یہاں تک قبرِ اصغر پر

گرا کر رکنِ ایماں بے حیا تکبیر کہتے تھے
نہ آئی شرم ان کو نعرۂ اللہ اکبر پر

بھرائیں پا بہ زنجیر اشقیا کانٹوں پہ چین اٗس کو
بدل سکتا نہ ہو کروٹ بھی جو بیمار بستر پر

شفق گوں مہر بھی وقتِ غروب ایسا ہی ہوتا ہے
مَلا تھا خونِ اصغر شہ نے جیسے روئے انور پر

خجل تھا تشنگی سے شہ کی پانی کس طرح آتا
جو نہریں کاٹ کر لائے تھے اعدا قبرِ اطہر پر

الا یا ایہا الساقی اَدِر کاساً و ناوِلہا
صفی روزِ جزا پڑھتا ہوا یوں جائے گا کوثر پر

سلام

ذوقِ ثنائے شہ میرے ہر جزوِ تن میں ہے
گویا زباں ہے ہر بُنِ مو جو بدن میں ہے

بے حد ہے اجر دیدۂ مومن کے اشک کا
جو ہے وہ دُرِ بیش بہا اس عدن میں ہے

اکبر سے نوجواں کا ملا خاک میں شباب
اب تک یہ داغ سینۂ چرخِ کہن میں ہے

غش آیا جس نے طشت میں دیکھا سرِ حسینؑ
سمجھا یہی کہ شمعِ تجلّٰی لگن میں ہے

تابِ سُہیل سے ہے ادیمِ یمن کو فیض
داغِ حسینؑ سینے میں خوشبو دہن میں ہے

شبنم ہے روضہ خوانیِ بلبل پر اشکبار
تقریبِ ماتمِ گلِ زہراؑ چمن میں ہے

مدفن میں آرہی ہے فرشتوں کو بوئے خلد
خاکِ شفا صفیؔ جو ہمارے کفن میں ہے

سلام

زخم ہے خونابہ افشاں دیدۂ پُرنم نہیں — نوکِ نشتر دل میں اک ڈوبی ہوئی ہے غم نہیں
اخترِ صبحِ قیامت ہے سرشکِ غم نہیں — چشمۂ خورشید ہے یہ قطرۂ شبنم نہیں
زندگی کا لطف کیا گر شاہِ دیں کا غم نہیں — آسماں یہ غم بدلنے کے خوشی سے ہم نہیں
اشکِ ماتم نوشدارو سے اثر میں کم نہیں — شہ کے زخموں کے لیے اس کے سوا مرہم نہیں
مسلکِ سلکِ امامت میں جو ہیں بارہ گہر — قدر و قیمت میں ہیں یکساں کوئی بیش و کم نہیں
جو رہیں معراج کی شب عاشق و معشوق میں — کوئی ان باتوں سے جز نفسِ نبی محرم نہیں
مومنوں کے غنچۂ دل کیا شگفتہ ہوں یہاں — سازگار ان کو ہوائے گلشنِ عالم نہیں
جھک گئی ہے پیٹھ اے غافل گنہ کے بوجھ سے — ضعفِ پیری کے سبب سے یہ کمر میں خم نہیں
چاہیے تھا چاہِ زنخدانِ علی اکبر کا عشق — اس سے بہتر کعبۂ دل کے لیے زمزم نہیں
ساز و ساماں ہے غمِ بے سازوسامانی مجھے — داغ تو دل میں ہیں کیسے میں اگر درہم نہیں
بہرِ جنگ آئے ہیں عباسِ دلاور صف شکن (ق) — صولت و ہیبت میں جو شیرِ خدا سے کم نہیں
مورچہ وہ کون سا ہے جو تہ و بالا نہ ہو — کون سا ہے وہ پرا جو درہم و برہم نہیں
اشکِ مومن دیکھ کر کہتا ہے یہ رضوانِ خلد — اس سے بہتر باغِ جنت کے لیے شبنم نہیں
ذرہ ہوں لیکن تنگ ظرفی نہیں مشرب مرا — مہر آسا جرعہ نوشِ ساغرِ شبنم نہیں
جان کر مردہ دباتی ہے زمیں یا بوتراب — آئیے بہرِ مدد مجھ ناتواں میں دم نہیں

نام پر پیاسوں کے رکھی ہے صفیؔ میں نے سبیل
جام ہیں پانی کے دونوں دیدۂ پُرنم نہیں

سلام

قدم جب ذاکرِ سبطِ نبی منبر پہ رکھتے ہیں
ملک لے کر انھیں قدموں کو اپنے سر پہ رکھتے ہیں

ملی ہے داد جورِ آسماں سے کس کو دنیا میں
دلِ نالاں اٹھاتے ہم اسے محشر پہ رکھتے ہیں

نہ دے گی اُن کو ایذا تشنگی روزِ قیامت بھی
بھروسہ جو قدح کش ساقیِ کوثر پہ رکھتے ہیں

بلا میں گھر گیا ہے اک جگر گوشہ محمد کا
ہزاروں سنگ دل ہیں باڑھ جو خنجر پہ رکھتے ہیں

صفی جس دل میں بھی ہو نورِ ایماں ہے وہ آئینہ
کہ اربابِ نظر اپنی نظر جوہر پہ رکھتے ہیں

سلام

وسعتِ ہستیِ موہوم ہے کیا کچھ بھی نہیں
عالمِ خوابِ پریشاں کے سوا کچھ بھی نہیں

آئے جو دم اسے تو جان غنیمت غافل
ہست و بودِ نفسِ پا بہوا کچھ بھی نہیں

جسم کیا چیز ہے اک رابطۂ چار اضداد
روح کیا شے ہے بجز حکمِ خدا کچھ بھی نہیں

چند روزہ ہیں یہ لذاتِ جہانِ فانی
دفعتہً آ گئی جس وقت قضا کچھ بھی نہیں

کیجیے غور تو جب خاک کا پیوند ہوئے
فرق مابینِ شہنشاہ و گدا کچھ بھی نہیں

خواہشِ ناز و تنعم ہوسِ مال و منال
زندگی تک ہے یہ سب بعد فنا کچھ بھی نہیں

مالکِ روئے زمیں کل جو تھے آج اُن کے لیے
تزک و جاہ و حشم تاج و لوا کچھ بھی نہیں

وہ جو کہلاتے تھے دنیا میں بڑے صاحبِ ہوش
چل بسے یوں کہ کہا اور نہ سنا کچھ بھی نہیں

فائدہ کیا جو ہوئی عمرِ خضر بھی حاصل
ایک دن جب ہے فنا پھر یہ بقا کچھ بھی نہیں

حشر تک بے عملِ خیر جیا کوئی تو کیا
حاصلِ زندگیِ سست وفا کچھ بھی نہیں

غیرِ اعمال پئے جادہ نوردانِ عدم
زادِ رہ، سازِ سفر، برگ و نوا کچھ بھی نہیں

بہترین عملِ خیرِ بشر کی خاطر — جز عزاداریِ شاہِ شہدا کچھ بھی نہیں

وہ بلا چین رہِ عشق کہ جس کے نزدیک — سختیِ منزلِ تسلیم و رضا کچھ بھی نہیں

گو ہے مشہور بہت قصۂ صبرِ ایوب — پر وہ حضرت کے مقابل میں ہے کیا کچھ بھی نہیں

حصرِ اوصافِ حسینؑ ابنِ علی کیونکر ہو — دست گاہِ خردِ عقدہ کشا کچھ بھی نہیں

حالِ شبیر وہ ہے سن کے جسے جن و بشر — تا قیامت جو کریں آہ و بکا کچھ بھی نہیں

خانہ بربادیِ اولادِ علیؑ کی تو نے — اے فلک حیف تجھے شرم و حیا کچھ بھی نہیں

شبِ عاشور شہِ دیں کو یقیں جب یہ ہوا — چارۂ کار بجز جنگ و وغا کچھ بھی نہیں

عمر سعد سے اس وقت بلا کر یہ کہا — کیا تجھے پاسِ رسولِ دوسرا کچھ بھی نہیں

قتل پر سبطِ نبی کے جو ہے یوں آمادہ — کلمہ گو ہے مگر خوفِ خدا کچھ بھی نہیں

مستِ جامِ مئے غفلت یہ ہوا ہے کہ تجھے — خبرِ داوریِ روزِ جزا کچھ بھی نہیں

خونِ ناحق کا مرے حشر میں کیا دے گا جواب — قتل کرتا ہے اُسے جس کی خطا کچھ بھی نہیں

چھوڑ دے فرقۂ گمراہ کا ساتھ اس طرف آ — کہ اُدھر نارِ جہنم کے سوا کچھ بھی نہیں

کوفیوں نے مجھے خط لکھ کے یہاں بلوایا — اور باعث مرے آنے کا ہوا کچھ بھی نہیں

اس جگہ پر نہ ہو منظور اگر میرا قیام — اس کی تدبیر بھی دشوار ہے کیا کچھ بھی نہیں

دے اجازت کہ کہیں اور چلا جاؤں میں — اب بھی تو ظلم سے باز آ کہ گیا کچھ بھی نہیں

الغرض وہ ستم ایجاد کلامِ شہِ دیں — سن کے خاموش رہا اور کہا کچھ بھی نہیں

پوچھی جب وجہ سکوت اس سے تو یہ کہنے لگا — قتلِ حضرت کے سوا قصد مرا کچھ بھی نہیں

پاؤں گا اس کے صلے میں جو حکومت رے کی — اس سے بڑھ کر ہے مرے واسطے کیا کچھ بھی نہیں

رفقا شاہ کے کہتے تھے یہ باہم دیگر — نہ کیا حقِ رفاقت جو ادا کچھ بھی نہیں

شاہ فرماتے تھے کس طرح کروں دعوتِ حُر — تیسرے فاقے سے ہوں آب و غذا کچھ بھی نہیں

لاش پر بھائی کی کہتے تھے یہ رو کر شبیر — بعد عباس کے جینے کا مزا کچھ بھی نہیں

تیرِ اصغر کے لگایا قدر انداز نے جب
خود قضا بول اٹھی اسکی خطا کچھ بھی نہیں

رو کے زینب نے کہا شہ کو کفن دوں کیونکر
مقنع و چادر و روبند و رِدا کچھ بھی نہیں

ناز پروردۂ آغوشِ شہنشاہِ عرب
اُٹھ گیا خلق سے سامانِ عزا کچھ بھی نہیں

کہتی تھی ہجرِ پدر میں یہی صغرا بیمار
جو مسیحا تھے انھیں فکرِ دوا کچھ بھی نہیں

قتل حارث نے کیے دونوں پسر مسلم کے
جان بچوں کی گئی مفت ملا کچھ بھی نہیں

ہے عبادت جبھی مقبول کہ ہو حُبِّ علی
ورنہ تسبیح و مناجات و دعا کچھ بھی نہیں

کس قدر اُن کی طبیعت میں تلوّن ہے صفی
اعتبارِ فلکِ نائبہ زا کچھ بھی نہیں

صفر المظفر ۱۳۴۵ھ مطابق دسمبر ۱۹۲۴ء

مسلمانو حرم قبضے میں ہے اک نامسلماں کے
مدینے میں دفینے کھد رہے ہیں آلِ عمراں کے

قیامت آئے گی اُس سرزمیں پر وقت سے پہلے
نشاں مٹوا رہا ہے آسماں گورِ غریباں کے

رقم اک جا بقیعِ پاک پر جو پنج سورہ تھا
کھٹکتے تھے نظر میں وہ نقوش اجزائے قرآں کے

کیا پامال بے دینوں نے اُن آیاتِ مصحف کو
حقیقت میں جو ٹکڑے تھے دلِ محبوبِ یزداں کے

یہ کافر کیفرِ کردار پا جاتے ابھی لیکن
مشیّت لے رہی امتحاں کچھ اہلِ ایماں کے

نتیجہ ورنہ جو ہونا ہے اس کا وہ بتاتے ہیں
شواہد واقعاتِ مشہدِ شاہِ خراساں کے

اراذل کیوں نہ سادات بنی ہاشم کے دشمن ہوں
کہ وہ گُل جس چمن کے ہیں یہ کانٹے اُس گلستاں کے

حمیت ہے اگر اسلام والو شہرِ یثرب سے
نکالو جاکے ان وحشی درندوں کو بیاباں کے

یہ کیا مردانگی ہے شیرِ قالین بن کے بیٹھے ہو
اٹھو جلدی اٹھو پیرو ہو کیسے شاہِ مرداں کے

پڑا تھا وقت جب اسلام پر عہدِ یزیدی میں
جہاں کو کارنامے یاد ہیں شاہِ شہیداں کے

یہ دیکھیں نصرتِ اسلام کو اب کون اٹھتا ہے
کمر میں اپنی گردانے ہوئے گوشوں کو داماں کے

علم اک ہاتھ اک میں ہاتھ میں تیغ شرر افشاں
رضاکاروں کے دستے ساتھ میں اس مرد میداں کے

یہی ہے خدمت دینی یہی اصلی قیادت ہے
یہی معیار ہے جوہر پرکھ لینے کی انساں کے

بہت آسان ہے جا کر مسجد جامع میں صف بندی
ٹھہرنا اک ذرا مشکل مقابل تیر و پیکاں کے

صفی راہ سعادت میں حقیقی رہنما وہ ہے
عمل میں علم میں یکساں ہوں پلّے جس کی میزاں کے

واقعہ

لگی ہے آگ یہ کن بیکسوں کی بستی میں
گھٹا ہوا ہے دھواں تنگنائے ہستی میں

ہے آج ماہ محرم کی چودھویں تاریخ
عزائے شاہ کی اندوہ آفریں تاریخ

بنی اسد کے قبیلے نے آج ہی کے دن
کیا ہے دفن اسے ہے جو خلق کا محسن

وہی وہی شہ بیکس ذبیح تشنہ جگر
رلا رلا دیا جس کو وہ کشتۂ خنجر

وہی حسین جو ہے شمع وادیِ ایمن
جسے چھپائے ہے خاک شفا تہِ دامن

حسین قتل ہوئے اہلبیت اسیر ہوئے
جو دستگیر جہاں تھے وہ دستگیر ہوئے

وہ شہر امیر عرب کی جو تھا خلافت گاہ
اسیر ہو کے وہیں اہلبیت جائیں آہ

جنھوں نے کعبہ کو ڈھایا کچھ اہل دیر نہ تھے
ارے وہ سب کلمہ گو تھے کوئی غیر نہ تھے

سر آیا شام میں تن کربلا میں واویلا
ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بکجا

تاریخی قطعات

صفی لکھنوی نے تاریخی قطعات جس رجسٹر پر درج کرائے تھے اُس رجسٹر کے آخری دو ورق مجھے مرزا کاظم علی قمر لکھنوی مرحوم (جو صفی لکھنوی کے ایک عزیز شاگرد تھے) نے عطا فرمائے تھے۔ اس پر ۱۵۱ سے لیکر ۱۶۸ تک قطعات درج ہیں۔ اس کے پہلے کے قطعات مجھے نہ مل سکے۔ لیکن اس ترتیب کو دیکھنے سے یہ یقین کامل ہوگیا کہ کُل ۱۶۸ قطعاتِ تاریخی صفی لکھنوی نے نظم کیے تھے جس میں سے ایک سے لیکر ۱۵۰ تک قطعات تلف ہو گئے۔ ۱۶۹ اور ۱۷۵ نمبر تک تاریخی قطعات مجھے اور دستیاب ہو گئے جن کو یہاں درج کر دیا گیا ہے۔ کاش باقی تاریخی قطعات بھی مل جاتے جن کے اضافے سے اردو ادب کا خزانہ اور معمور ہو جاتا۔

صفی لکھنوی اپنے تاریخی قطعات کے مجموعہ کو "صحیفۃ العدد" کے عنوان سے چھپوانے کا ارادہ رکھتے تھے۔ لیکن شاعر کی مالی مشکلات اور اُردو شاعری کے قدردانوں کی عدم توجہی کی وجہ سے یہ مجموعہ شایع نہ ہو سکا۔ کوشش انشاء اللہ جاری رہے گی باقی قطعات ملتے ہی ان سب کو "صحیفۃ العدد" کے نام سے شایع کیا جائے گا۔

سید زائر حسین کاظمی

نمبر (۱۵۱) تاریخ وفات نواب امجد علی خاں

بہ سال عیسوی چوں فکر کردم ندا آمد بگوشش از چرخ گرداں
بخواں ترجیع و بکشا چشم عبرت ببیں ایں تربت امجد علی خاں

سنہ ۱۹۳۶ء

نمبر (۱۵۲) تاریخ وفات اہلیہ مولانا سید محمد سبطین صاحب زادہ مجدہٗ حسب فرمائش جناب موصوف

پاک دل مومنہ و ذاکرۂ سبطِ نبیؐ عازمِ ملکِ بقا گشت ازیں ارض خسیس
گفت ہاتف بہ صفی سالِ وفاتش سرِ قبر
رفتہ در خلدِ بریں سیدہ بیگم بنویس

۲ر جولائی سنہ ۱۹۳۶ء مطابق ۱۲ر ربیع الثانی سنہ ۱۳۵۵ھ

نمبر (۱۵۳) قطعہ تاریخ وفات میرزا محسن

مالِ دنیا در کفِ آزاد کے گیرد قرار بیشِ ایں مرحوم چوں کاہے ز دولت بود کوہ
شکوہ سنجِ اقربائش رفت ازیں محنت سرا خاطرش از بختِ نافرجام شد چنداں ستوہ
مصرعِ تاریخِ رحلت نقش زد کلکِ صفی
قبرِ پاکِ میرزا محسن رئیسِ باشکوہ

۵ر جمادی الاولیٰ سنہ ۱۳۵۵ھ مطابق ۲۵ر جولائی سنہ ۱۹۳۶ء

نمبر (۱۵۴) قطعہ تاریخ وفات بیوۂ ڈپٹی رضا حسین صاحب ۱۲ر جنوری سنہ ۱۹۳۷ء مطابق ۲۸ر شوال سنہ ۱۳۵۵ھ

از جنوری دوازدہم بود کز جہاں ایں مومنہ بحکمِ خدا وند مشرقین
شد دیگرے بروضۂ رضواں و حوریاں آراستند قصرِ جہاں را بزیب و زیں
کلکِ صفی بلوحِ مزارش رقم نمود
والا شکوہ بیوۂ ڈپٹی رضا حسین

۱۲ر جنوری سنہ ۱۹۳۷ء مطابق ۲۸ر شوال سنہ ۱۳۵۵ھ

نمبر(۱۵۵) تاریخ وفات مولوی شفقت حسین صاحب وکیل
حسب فرمائش منشی حکایت یار خاں صاحب اہلمد عدالت دیوانی لکھنؤ

دوم چوں از جمادی الاول آمد بجنت رفت این مرد حق آگاہ
صفی بر تربت پاکش رقم زد
مزار مولوی شفقت حسین آہ

۲ر جمادی الاولی ۱۳۵۵ھ = ۲۲ر جولائی ۱۹۳۶ء

نمبر(۱۵۶) قطعہ تاریخ وفات پرنس خسرو میرزا صاحب مرحوم

بروز ہفدہم از ماہ دوم برفت ایں عبد صالح سوئے معبود
دلش بعد سفر در خانۂ خویش زمشہد آمدہ چندے بیاسود
کہ در حق ناگہاں شد عازم خلد عزیزوا قربا را کردہ پدرود
برائے ماتم شاہ شہیداںؑ بدربار ائمہ راہ پیمود
صفی بر تربت پاکش رقم زد
بلند اقبال خسرو میرزا بود

۱۷ر صفر ۱۳۵۶ھ مطابق ۲۹ر اپریل ۱۹۳۷ء

نمبر(۱۵۷) قطعہ تاریخ وفات سید محمد حسنین مرحوم
خلف مولانا سید محمد سبطین صاحب قبلہ

صبح جمعہ سوم از ماہ ربیع الاول آہ فرزند جواں سال محمد سبطین
بست رخت سفر از دہر سوئے ملک عدم شد شرعتکدۂ خاص پُر از شیون وشین
نقش زد کلک صفی سال سرِ لوح مزار
کرد آرائش فردوس محمد حسنین

۳ر ربیع الاول ۱۳۵۶ھ مطابق ۱۴ر مئی ۱۹۳۷ء

نمبر (۱۵۸) تاریخ وفات حسرت آیات زائر سبط رسول الثقلین عبد سید مقبول حسین متخلص بہ ظریف

بازوئے صفی جگر افگار شکست آہ — از مرگ ظریف ابر گہر زائے ظرافت
سال رحلتش رفتہ آزاد بفردوس — مقبول حسین انجمن آرائے ظرافت

شب پنجشنبہ ۲۶ شوال ۱۳۵۶ھ مطابق ۳۰ دسمبر ۱۹۳۷ء

نمبر (۱۵۹) قطعہ مندرجہ ذیل مزار ظریف مرحوم پر کندہ ہے۔ مزار مذکور کھجوے پر ناظم صاحب کے باغ میں ہے

رفت وقتیکہ ظریف از دنیا — صفی آمد ز در خلد ندا
مرحبا سید مقبول حسین — زائر سبط رسول الثقلین

شب پنجشنبہ ۲۶ شوال ۱۳۵۶ھ مطابق ۳۰ دسمبر ۱۹۳۷ء رحلت کی۔

نمبر (۱۶۰) تاریخ وفات سید حسین عرف نواب جانی خلف نواب سید محمد خاں مرحوم مزار پر کندہ ہے

جوانمرگی سید حسین چوں بشنید — دل صفی حزیں گشت زیں حزن بہ تعب
نوشت سال خرامش بسوئے گلشن خلد — نمود خار اجل پائے او فگار عجب

۱۳۵۶ھ

نوٹ:۔ مرحوم ایم اے کے متعلم تھے بیس برس کا سن نہایت توانا و تندرست ٹنس کھیلنے میں ایک کیل تلوے میں لگ گئی دفعتہً زہرباد ہو گیا اور دو ہی روز میں مر گئے۔ تاریخ رحلت ۲ ذیقعدہ ۱۳۵۶ھ مطابق ۵ جنوری ۱۹۳۸ء ہے۔

نمبر (۱۶۱) تاریخ وفات مسماۃ باقری بیگم مرحومہ بنت آغا محمد رضا خانصاحب مدن صاحب۔

بستہ رخت زندگانی این عزیزہ در شباب — ناشکیب نامراد از بزم امکانی برفت
سال پیشین کہ خدا گر دیدہ بود امسال حیف — یک چراغ مردہ را دو شمع نورانی برفت
بعد عاشورا بقصد پرسہ ہنگام مسا — نوحہ گر پیش بتول از جوش ایمانی برفت

دید برپا ماتمِ سبطِ نبیؐ چون در جنان — در صفِ حوران برائے اشک افشانی برفت

سالِ رحلت خواست از من والدش گفتم صفیؔ

باقری بیگم (بگو)، از عالمِ فانی برفت

۳۸۵ — ۹۷۲

سنہ ۱۳۵۷ھ

یکشنبہ ۱۰ محرم ۱۳۵۷ھ مطابق ۱۳ مارچ ۱۹۳۸ء

نمبر (۱۶۲) تاریخ وفات اہلیۂ نواب آغا جانی صاحب خلف نواب قدسیہ بیگم

روز سہ شنبہ کہ بستم از مہِ ذی الحجہ بود — راہیِ جنت شد این خاتونِ فرخندہ شیم

بر سرِ لوحِ مزارش نقش زد کلکِ صفیؔ — گرد تن صاحبہ مسکن بگلزارِ ارم

سنہ ۱۳۵۶ھ

۳۰ ذی الحجہ ۱۳۵۶ھ مطابق ۲۲ فروری ۱۹۳۸ء

نمبر (۱۶۳) تاریخ وفات نواب گوہر علی خاں مرحوم برادر نواب یوسف علی خاں صاحب رئیس

فغان بکین پسندیدہ خو، پاک طینت — بعہدِ جوانی جدا شد ز اخوان

تعلق چو میداشت در تان پارہ — بسر برد آنجا بصد شوکت و شان

در آن سرزمین ناگہان ابتلا زد — نشد نفع چندانکہ کردند درمان

بروزیکہ رفت از جہان سوئے جنت — ز ماہِ صفر بود سادس عشر آن

صفیؔ از دلِ صبر برخاست شیون

جوان مرد نواب گوہر علی خان

سنہ ۱۳۵۷ھ

نمبر (۱۶۴) تاریخ وفات مسماۃ محمدی بیگم مرحومہ والدۂ شاہزادہ ہمایوں جاہ صاحب

خویش پرنس مرزا ثریا قدر بہادر مغفور

بجنت فرخندہ خوئے فرخ شاد — ذی شرف مادرِ ہمایوں جاہ

پاک طینت محمدی بیگم | تابعِ شرعِ احمدی بیگم
بسفر بست زین جہان محمل | داغِ فرزند اصغرش .بر دل
رحلت از دہر، او زِ جمعہ نمود | کز ربیع دوم چہارم .بود
چند روزہ جنازۂ اُو را | خلفِ اکبرش سپرد اینجا
تاکند باز دفن نعش درا | بحرم گاہِ سید الشہداء
زانکہ مرحومہ در زمانِ حیات | بعد فخر زیارتِ عتبات
خواست چوں مرگ چشمِ او بندد | خاک با خاکِ پاک پیوندد
تا شود پیکرش .بوقت نشور | با شہیدانِ کربلا محشور
بادلِ داغدار و چشمِ پُر آب | سالِ فوتش چو خواستند احباب

این رقم زد صفی نکتہ سرا
جائے گاہش بپائے خاکِ شفا

۱۳۵۷ھ

نمبر(۱۶۵) تاریخ وفات اچھے صاحب شہرت مرحوم خلف لطافت مغفور - ابن امانت مبرور)

سید باقر حسن سخن ور | آن سایہ نشینِ نخل طوبے
بست وہشتم زماہِ جم | چون کرد وداعِ دارِ دنیا

بنوشت صفی بلوحِ قبرش
شہرت بجنان رسید از ینجا

۱۳۵۸ھ

۲۸ر جمادی الاولی ۱۳۵۵ھ مطابق ۲۰ر جولائی ۱۹۳۶ء روز چہارشنبہ

نمبر(۱۶۶) قطعہ تاریخ وفات مسماۃ صفیہ خاتون - خوشدامن موسیٰ جعفری سلمہ

آمد خبر مرگ صفیہ خاتون | دیدیم صفی دخترش را محزون

مرحومہ صباحِ ہفتم ماہ رجب بنہاد قدم زدارِ فانی بیرون

درخاک سپرد وندا ز در رضوان

فردوس بمرقدِ صفیہ خاتون

ستمبر ۱۹۳۶ء مطابق ۱۳۵۵ھ

نمبر (۱۶۷) قطعہ تاریخ وفات مولانا مولوی سید ظہور الحسن صاحب قبلہ مرحوم مجتہد العصر طاب ثراہ

بروز غرۂ ذیقعدہ ماہ و یوم السبت | کہ رفت سبط از یں ہر سید ذی جاہ
نہادہ رو بغروب آفتاب فضل و کمال | صفی بچشم احبا زمانہ گشت سیاہ
چو ظلّ عاطفت او نماند بر سر شان | دل تلامذہ خون گشت زیں غم جانکاہ
قرار یافت زہنہ ش بر ندسکے عراق | فروغ بخت حسین مآل اوست گواہ
بعاریت تنِ خاکی سپردہ شد اینجا | از انکہ خلد بریں آمدش نشیمن گاہ
بکربلائے معلّٰی بروکہ تا بینی | جنازہ اش بسر دوشِ قدسیان ہمراہ

بقرب شاہ شہیداں چو رفت آن مرحوم

ندا رسید ظہور الحسن اجاک اللہ

نمبر (۱۶۸) دیگر قطعہ تاریخ ۱۳۵۵ھ مطابق ۱۹۳۶ء

مرحوم کا اسم معروف ظہور الحسن اور اصلی نام ظہور الحسین تھا لہذا مؤخر الذکر نام کے لحاظ سے قطعۂ ذیل کہا گیا

تاریک شد جہانِ حقائق بچشم خلق | چون آفتاب فضل بزیر زمیں نہفت

از دل چو سال رحلت او خواستم صفی

واسیداہ گفتہ ظہور الحسین گفت

۱۳۵۵ھ

نمبر(١٦٩) مرزا بہادر محمد عباس علی خاں صاحب جگر رئیس لکھنؤ کے انتقال پر ملال
کے موقع پر یہ قطعہ مجلس سوم میں بتاریخ ١٦ مئی ١٩١٠ء صفی لکھنوی نے
خود پڑھا تھا۔

اوج گیر نسیم خلد ہے آج — دم جو گل تھا بہار باغِ اودھ
وہ سمیِ محمدؐ و عباسؑ — عرش پر جس سے تھا دماغِ اودھ
اللہ اللہ فروغ نام جگر — تابشِ لعلِ شب چراغ اودھ
خون ہو کر بہے تو دور نہیں — لکھنؤ قلب داغ داغ اودھ
صفیؔ آنکھوں میں ہے جہاں تاریک — ہائے گل ہو گیا چراغ اودھ

١٣٢٨ھ

نمبر(١٧٠) قطعہ تاریخ وفات اہلیہ خود صفیؔ لکھنوی

بروز جمعہ وبست ویکم از ماہ ذی قعدہ
چوں بوئے گل جدا شد وقت عصر روح از پیکر
صفیؔ در ماتم ہم راز بودم تا ندا آمد
بہشت آرام گاہ طیبہ بیگم بود بنگر

١٣٥٧ھ

نمبر(١٧١) قطعہ تاریخ

جہاں کیا ہے عدم کے مسافروں کی سرا — ہے آج کوچ یہاں کل مقام تھا جس کا
ہزاروں قافلے ہر روز آتے جاتے ہیں — بندھا ہوا ہے گذرگاہوں کا اک تانتا
نہیں ہے سرحدِ ہستی سے نیستی کچھ دور — ملا ہوا ہے حیات و ممات کا ڈانڈا
وجودِ ملکِ عدم میں تو کوئی شبہ نہیں — وہاں کا حال مفصل مگر نہیں ملتا
کہ جو یہاں سے گئے آہ ان پہ کیا گذری — اب آگے ان کا طریق معاشرت ہے کیا

وہاں بھی ہیں یہی پابندیاں کہ آزادی — وہاں بھی ہے کہ نہیں ملک و مال کی پروا
وہاں بھی ہے کہ نہیں افتخار کا خلعت — وہاں بھی ہے کہ نہیں اعتبار کا تمغہ
وہاں بھی ہیں کہ نہیں وصل و ہجر کے جھگڑے — وہاں بھی ہے کہ نہیں حسن و عشق کا چرچا
وہاں بھی ہے کہ نہیں انقلاب لیل و نہار — وہاں بھی ہے کہ نہیں انتظام صیف و شتا
وہاں بھی ہے کہ نہیں حاجتِ لباس و مکاں — وہاں بھی ہے کہ نہیں احتیاج آب و غذا
وہاں بھی ہے کہ نہیں ہے تصرف آلات — وہاں بھی ہے کہ نہیں ہے تعلق اعضا
وہاں بھی ہے کہ نہیں ہے یہی نشیب و فراز — وہاں بھی ہیں کہ نہیں یہ پہاڑ یہ دریا
اسی روش کے وہاں بھی ہیں یا نہیں گلشن — اسی طریق کے ہیں یا نہیں وہاں صحرا
یہی زمین یہی آسماں وہاں بھی ہے — یہی وہاں بھی ہے دورِ زمانہ صبح و مسا
وہاں بھی ہے یہی نظم و نسق کہ اور کوئی — ہے عزل و نصب وہاں بھی یہی کہ اسکے سوا
یہاں تو آہ کسی شے کو بھی ثبات نہیں — غرورِ ہستیٔ ناپائدار ہے بے جا
جو لذتیں ہیں یہاں کی وہ جملہ فانی ہیں — جو نعمتیں ہیں یہاں کی نہیں ہے ان کو بقا
بڑے بڑے وہ سلاطین شہرۂ آفاق — کہ جن کے نام کا بجتا تھا رات دن ڈنکا
بڑے بڑے وہ بہادر یلانِ زور آور — نہنگِ بحرِ وغا شیرِ بیشۂ ہیجا
بڑے بڑے وہ اولوالعزم صاحبِ دولت — کہ جن کے پاس تھا زر لاتعد ولاتحصیٰ
بڑے بڑے وہ فلاطون خیال ارسطو فکر — حکیم و فلسفہ دانِ حقیقتِ اشیا
بڑے بڑے وہ زباں آورانِ معنی سنج — کہ تھے جہاں میں جو موجدِ سخن گویا
بڑے بڑے وہ ہنر پیشہ گانِ چابکدست — کہ جن کو صنعت و حرفت میں تھا ید طولیٰ
بڑے بڑے وہ حسینانِ انجمن افروز — چراغِ حسن ہی تھی جن کی شکلِ مہر ضیا
بڑے بڑے وہ رسولانِ باخبر ذی ہوش — کہ تھے جو محرمِ اسرارِ عالمِ بالا
ملے زمانہ کے ہاتھوں سے خاک میں آخر — کسی کے ساتھ بھی کی عمرِ بے وفا نے وفا؟

ہزار حیف کہ دیتا نہیں ہے اب کوئی کام
وہی دماغ جو کل قوتوں کا تھا مبدا

گیا حیات کے ہمراہ لطفِ دید و شنید
نہ گوش ہی شنوا ہے نہ چشم ہی بینا

وہی زباں جو مزے لوٹتی تھی دنیا کے
وہی زباں کہ جو تھی بذلہ سنج و نغمہ سرا

وہی زباں جو کلیدِ درِ معانی تھی
وہی زباں کہ جو تھی مایہ دارِ حُسنِ ادا

وہی زباں کہ جو تھی عرصہ گاہِ بحث میں سیف
وہی زباں کہ جو تھی نشترِ دلِ اعدا

وہی زباں کہ تقریر جس کی جادو تھی
وہی زباں کہ اعجاز تھا بیاں جس کا

وہی زباں کہ جس میں بھرا تھا زورِ اثر
کبھی نہ تھا غلط انداز جس کا تیرِ دعا

ہزار حیف ہوئی ہے کچھ اس طرح خاموش
کہ اس کو تھی ہی نہیں قدرتِ سخن گویا

بہارِ ہستیٔ موہوم دیکھنے والو
طلسمِ دیدۂ عبرت نگاہ ہے دنیا

رہا ہے کوئی نہ رہ جائے گا مگر وہ نام
دلوں پہ اہلِ زمانہ کے نقش ہو جس کا

کہاں ہیں آج وہ فیاض ہاتھ اے طلاّب
پڑی تھی جن سے کل اس مدرسہ کی آہ بنا

ارے کہاں ہے وہ بحرِ نوال و ابرِ کرم
ارے وہ خیرِ مجسّم وہ خلق کا پُتلا

سحابِ فیض سمیِٔ محمدؐ و عباسؑ
کہ جس کی فاتحہ خوانی کی ہے یہ بزمِ عزا

کوئی سنا دے یہ فریادِ مدرسہ اس کو
یہ سیکڑوں دلِ نازک کے ٹوٹنے کی صدا

اسی کے دم سے تھی اے لکھنؤ عزاداری
کہاں گیا وہ فدائی حسینؑ بیکس کا

وہ ساقِ عرشِ محبت کے پایۂ تابوت
دیے ہوئے علمائے کرام تک کاندھا

وہ ساتھ تھے جنازے کے محشرستاں ایک
تمام شہر میں برپا قیامتِ کبریٰ

ہزار حیف وہاں خاک اُس دن اُڑتی تھی
وہ آستانہ جو امید گاہِ عالم تھا

صفیؔ زباں پہ یہ تاریخ آنکھ میں آنسو
ستارہ ڈوب گیا آسمانِ ہمت کا
۱۳۲۸ھ

نوٹ:۔ یہ قطعہ تاریخ ۲۲ مئی ۱۹۱۰ء کو مولانا صفیؔ لکھنوی نے مدرسہ ناظمیہ میں منعقدہ اس مجلس فاتحہ خوانی میں پڑھا جو مرزا بہادر محمد عباس علی خاں جگر مغفور کے ایصالِ ثواب کے لیے کی گئی تھی۔ سید نثار حسین کاظمی

نمبر (۱۶۲)

ترکیب بند تاریخی

(۱)

گھر وہی گھر ہے مگر جلوۂ جانانہ نہیں — ہے صنم خانہ وہی شمع صنم خانہ نہیں
ایک ساقی کو فقط ڈھونڈھ رہی ہیں آنکھیں — کیا نہیں غم نہیں شیشہ نہیں پیمانہ نہیں
شیشے ٹوٹے ہیں کہ دل اُف رِی غم انگیز صدا — نالۂ درد ہے یہ نالۂ مستانہ نہیں
نبھ سکا ساتھ جہاں تک وہ نبا ہا ہم نے — یا تو اب ہم نہیں یا تو دلِ دیوانہ نہیں
شبنم آلود ہیں دونوں ہی وہ سبزہ ہو کہ گُل — چشمِ تر کون یگانہ نہیں بیگانہ نہیں
رشتۂ سلک میں سرمایۂ نازش جو تھا — کیا قیامت ہے وہی گوہرِ یکدانہ نہیں
سُن کے چپ ہیں مرے ٹوٹے ہوئے دل کی آواز — متحیر ہوں یہ کیا درد کا افسانہ نہیں
چھوڑ کر صحبتِ اصحاب کہ جانا کیسا — ہم نے مانا کہ وہ جنت سہی ویرانہ نہیں
کیا ہے خلوتکدہ میں مشغلۂ تنہائی — پاس آئینہ نہیں وسمہ نہیں شانہ نہیں
اور بھی روتے ہیں یہ دیکھ کے رونے والے — جمع پروانے تو ہیں شمعِ عزا خانہ نہیں

کون وہ شمعِ عزا خانہ محمد عباسؒ
محفلِ نور کا پروانہ محمد عباسؒ

(۲)

آہ وہ حاکمِ دوران و معارف آگاہ — دولتِ آلِ محمدؐ کا سفیرِ ذی جاہ
صاحبؑ الامر کا وہ معتمد با تمکین — ناظمِ مملکتِ دینِ حق اسلام پناہ
خادمِ شرع وہ سرکارِ حسینیؑ کا امین — دار الایمان کا وہ رکن رکین طاب ثراہ
آسماں پایہ ہما سایہ کریم ابن کریم — عرشِ ہمت کا ستارہ فلکِ قدر کا ماہ
وہ اولو العزم سخا پیشہ ملاذ الغربا — اہل حاجت کو جو کرتا تھا عطا خاطر خواہ

لکھنؤ! حیف کہ اب تجھ سے ہوا دامن کش
لے گیا خلد سب اسباب تنعم ہمراہ

تیرے دلہائے پریشاں کی جو شیرازہ تھی
لکھنؤ! پھر گئی کیوں تیری طرف سے وہ نگاہ

کیا کریں گے نہ اگر صبر کریں گے لیکن
اے دل سوگ نشیں داغِ جگر ہے جانکاہ

سب سے منہ پھیر کے او خلد میں جانے والے
پھر ادھر ایک نظر دیکھ لے مُڑ کر للّٰلہ

بے شکن جامۂ ہستی تھا ابھی۔ تھی نہ خبر
اس قدر ہوگا تری عمر کا دامن کوتاہ

تو نے اس بزم سے جانے میں بہت جلدی کی
باغِ فردوس بسانے میں بہت جلدی کی

(۳)

پہنے اک رخت کفن تن پہ وہاں جاتے ہو
بھیس بدلے ہوئے یہ آخر کہاں جاتے ہو

نہ کہو جا ہے سمجھتے ہیں سمجھنے والے
شائق سیر و تماشائے جناں جاتے ہو

احتیاطاً لبِ گفتار پہ ہے مُہرِ سکوت
محوِ کیفیتِ اسرارِ نہاں جاتے ہو

جیتے جی خلد میں تعمیر کیے تھے اکثر
دیکھنے آج وہی اپنے مکاں جاتے ہو

دلِ احباب سے پوچھو جو لیے ہیں تابوت
کیا خبر تم کو سرِ تختِ رواں جاتے ہو

خدمتِ ساقیٔ کوثر کے بہت شائق تھے
جانبِ انجمنِ پیرِ مغاں جاتے ہو

ہم نشینوں کو ذرا بھول نہ جانا جا کر
پھر جہاں سے نہیں آتے ہیں وہاں جاتے ہو

تم سے دیکھا نہیں جاتا تھا کسی کا رونا
کیوں ہمیں چھوڑ کے خونابہ فشاں جاتے ہو

باغِ عالم میں کہاں آب و ہوا جنت کی
بہ تمنائے علاج خفقان جاتے ہو

حشر کے روز ملیں گے جو خدا نے چاہا
شوق سے جاؤ بس اب جاؤ جہاں جاتے ہو

خوش رہو شاد رہو گھر کا گھر آباد رہے
بے رخی اہلِ محبت سے مگر یاد رہے

(۴)

لکھنؤ! پیکرِ بے جاں میں ترے دل تھا کوئی — رہ نوردوں کا چراغِ سرِ منزل تھا کوئی

خود بخود اس کی طرف خلق کے دل کھنچتے تھے — مرکزِ دائرۂ جذبۂ کامل تھا کوئی

وادیٔ جود و سخا طے کیے حاتم کی طرح — ناقۂ شوق! ترا صاحبِ محمل تھا کوئی

جا بجا فاتحہ خوانی ہے کسی کی اب تک — اس کو یوں یاد کریں ہم اسی قابل تھا کوئی

کھیتیاں ہیں عملِ خیر کی کیسی سرسبز — آخر اس مزرعِ دنیا کا بھی حاصل تھا کوئی

اسے کہتے ہیں عزادارئ دلبندِ بتولؑ — ذکرِ شاہِ شہدا سنتے ہی بسمل تھا کوئی

حُسنِ اخلاقِ حسینیؑ کا نمونہ ہمہ تن — امتحان گاہِ بلا میں متحمل تھا کوئی

زالِ دنیا کا فریب اُس پہ نہ چل سکتا تھا — صاحبِ ہمتِ مردانہ و باذل تھا کوئی

مٹھیوں میں صفتِ غنچہ زرِ نقدِ مراد — مایۂ بسط و کشادِ کفِ سائل تھا کوئی

پاک نفسی کو جو دیکھو بخدا روح تھا روح — ذوقِ ہمت کو جو پوچھو ہمہ تن دل تھا کوئی

تیرا ماتم وہ ترا منعمِ باذل نہ رہا
لکھنؤ! ناز تھا جس پر تجھے وہ دل نہ رہا

(۵)

تیرہ تر شامِ غریباں سے ہے اب صبحِ وطن — یادِ ایام کی تھی چشمِ محبت روشن

سب کی آنکھیں جسے اب ڈھونڈ رہی ہیں سرِ بزم — یادِ ایام یہیں تھا وہ کبھی جلوہ فگن

دامنِ خلد میں اب ہے جو مہکتا ہوا پھول — یادِ ایام یہ شہر اُس سے کبھی تھا گلشن

نیند آتی ہی نہ تھی جس کو اندھیرے میں کبھی — حیف وہ اور یہ تاریکیٔ کنجِ مدفن

نرم سے نرم بھی پوشاک جسے چبھتی ہو — جسمِ نازک وہ کہاں اور کہاں زحمتِ کفن

سو نہ سکتا ہو نزاکت سے جو فرشِ گل پر — بسترِ خاک ہے اب اور وہ مجروح بدن

بن گیا نزع میں آئینہ شکستِ دل کا — وہی ماتھا کبھی دیکھی ہی نہیں جس پہ شکن

حیف اک فاتحہ کو اب ہے ہمارا محتاج — وقفِ احباب جو تھا تادمِ آخر ہمہ تن

مشغلہ جن کا رہا عقدہ کشائی اک عمر — آج وہ ہاتھ ہیں اور آلِ عبا کا دامن

پھر رہی ہے کوئی تصویرِ صفیؔ آنکھوں میں — دل یہ کہتا ہے کہ تاریخ یہ ہو ختمِ سخن

رہے ساقی ترا آباد بھرا میخانہ

خیمۂ نو لبِ کوثر ہے سجا شاہانہ

(سنہ ۱۹۱۰ء)

سنہ ۱۹۱۰ء

نوٹ:- یہ نظم بھی صفیؔ لکھنوی نے سنہ ۱۹۱۰ء میں مرزا بہادر محمد عباس علی خاں جگرؔ کی مجلس جہلم میں خود پڑھی تھی۔

سید زائر حسین کاظمی

نمبر(۱۷۳) ینگ صاحب بہادر جوڈیشل کمشنر کے کتخدائی کا تاریخی مصرع

"مبارک، آج ہے تقریبِ شادی"

سنہ ۱۳۰۹ھ

نمبر(۱۷۴) تاریخ وفات پسر شیرخوار مسمی محمد مہدی (داغِ جگرسوز)

سنہ ۱۳۰۱ھ

بجع سہ — ہمیں ہے دونوں جہاں میں اُمیدِ فضلِ رسول

بجع سہ — ایکہ بر خلق تولی ہم چو محمد محسن

بارِ احسان تو بر گردنِ بر نا و مسن

از سرِ صدق نہ تحسین گنمت یک من و بس

حُسنِ اخلاقِ ترا ہر کہ و مہ مستحسن

سنہ ۱۸۸۶ء

فارسی کلام

قطعہ تاریخ بمرگ مادرِ خود نوحۂ صفیؔ حزیں

الامان از دست بیداد سپہر فتنہ زائے
آنکہ ریزد خون ما بیصرفہ از تیغ جفائے

نیست غیر از خستن دل مدعائے دور چرخ
بہر این یکدانہ باشد گردش نہ آسیائے

چرخ را از مہر بے برگیم دل دہ چہ سوخت
در مہِ عیدم مہیا کرد سامان عزائے

باز اے گردون سر آزار ما داری چرا
گر نہ بیگانہ از حال دل درد آشنائے

غنیمت دیوانۂ ہشیار اندر کار خود
داشت فرزانۂ از بہرِ ما شوریدہ رائے

رحم کن رحمے خدارا کاین دل بیطاقتم
برنتابد بیش ازین بارِ غم صبر آزمائے

آن زیانم کردۂ اے آسمان کز ہیچ سود
نیستش ممکن تلافی تا دمِ صبح جزائے

راندۂ زخمے کہ آنرا بہ نسازد مرہمے
دادۂ دردیکہ آن زائل نگردد از دوائے

سایۂ لطفِ خدائی بود ظلِ مادرم
از سرم برداشتی آن سایۂ لطف خدائے

آہ اے مادر کجائی نشنوی فریاد ما
برلب آمد جان فرزندانت جوش بکجائے

مائیہ راحت رسانی جز تو ام دیگر نبود
آنہم ایدار رفت از دستم درین محنت سرائے

تا تو بودی در گدائی فرِ شاہی داشتم
بر سرِ من سایہ ات میبود چون ظلِ ہمائے

تا بروز واپسینت بودۂ از بہر ما
منہمک در اہتمامِ کسوت و آب و غذائے

انکہ آب دیدہ ام اندر غمت از سر گذشت
کشتیٔ اہل و عیالم را تو بودی ناخدائے

یکجان از بہرِ دیدار تو مینالند زار
از درونِ خلوتِ کتمِ عدم بیرون بیائے

ہم چنیں گاہے ندیدستم ترا غافل بخواب
میدہم آواز وازتو نمی خیزد صدائے

آن جگر بندِ تو اے مادر کہ از من کوچکیست
آرزو داشتی کو را بہ بینی کدخدائے

آنکہ اندر دردِ ہجرت بگریستی تا نیمہ سال
چون بسوئے کربلا گردید بختش رہنمائے

یازده روز است اکنون کز سفر باز آمدست / لیک رنجور و دژم از جور چرخ نارسائے
چشم از دیدن درین ایام شایانت نبود / این چه بی مهریست اے مادر لب پاسخ گشائے
اے مزارت سجده گاہم کعبهٔ من بوده / می سزد گر بر سر خاک تو باشم جبه سائے
بے تو چون در خانه آیم با که گویم درد دل / بے تو چون ہنگام رفتن با که می جویم رضائے
بیخبر از حالِ ما بودن بگو از بهر چیست / زانکه تو غمخوار ما بودی درین محنت سرائے
وقتِ رفتن آه دست خود ز من برداشتی / مادر آخر من نه در پیری ترا بودم عصائے
چارهٔ دردِ حسرت جستم ولے غافل ازین / در سرت افتاده بود از گلشنِ جنت ہوائے
اینکه بے من خوردن چیزے گوارایت نبود / در جنان بر خوانِ نعمت با ندادستی صلائے
از ہجومِ غم چو زندان خانه بر من تنگ شد / مادرِ من در دل و چشم منت خالیست جائے
لب فرو بند اے صفی از نالهائے دلگداز / نوحه خوانی تا بکے بگذر ز شرح ماجرائے
زنده را داغِ عزیزان گر نبودے ناگزیر / مرگِ مریم را ندیدے عیسیٰؑ معجز نمائے
الولاء للبلاء والصبر مفتاح الفرج / چون شنیدستی تو ہم اندر شکیبائی گرائے
وز پئے ترویحِ روحِ مادرِ غمخوارِ خود / فاتحه برخوان و حق خدمتش مسکین ادائے
گر ورودِ رحمتِ یزدان ہمی خواہی بگو / ہان بدرگاهِ خدا بردار دستِ التجائے
یار الہا از برائے لطفِ عام خویشتن / وز پئے خاصانِ خود از ابتدا تا انتہائے
بہر ترویحِ جناب رحمة للعالمینؐ / آنکه خلقش ہمچو خُلقِ تست بر خلق خدائے
بہر ترویحِ جنابِ نفسِ ختم المرسلینؐ / زور بازوے نبیؐ و دستِ حق مشکل گشائے
بہر ترویحِ جنابِ سیده خیر النساءؑ / راحتِ جان و جگر بندِ رسولِ کبریائے
بہر ترویحِ امامِ دوّمین یعنی حسنؑ / سیدِ مسموم اے جان منش باد فدائے
بہر ترویحِ شفیع المذنبین آقا حسینؑ / آن شہیدِ تشنه لب مظلومِ دشتِ کربلائے
بہر ترویحِ علیؑ بن الحسین خسته جان / سرگروهِ جاده پیمایانِ تسلیم و رضائے

بہر ترویجِ محمد باقرؑ عالی نسب   آنکہ دریائے شرف راہست در بے بہائے

بہر ترویجِ امام جعفر الصادقؑ کہ بود   ذات پاکش مایۂ صد نازش صدق و صفائے

بہر ترویجِ امامِ موسیٰ کاظمؑ کہ او   پیروِ حق بودہ اندر شیوۂ عفو خطائے

بہر ترویجِ شہِ غربت وطن موسی رضاؑ   رہ نورد جادۂ صحرائے تسلیم و رضائے

بہر ترویجِ سریر آرائے بزمِ اتقا   شاہ دیں پرور تقیؑ اہلِ ورع را پیشوائے

بہر ترویجِ صفیِ الاصفیا اعنی نقیؑ   قدوۂ صافی دلان پاکیزہ نفس و پاک رائے

بہر ترویجِ جناب عسکریؑ دین پناہ   آنکہ اقلیمِ شریعت را بود فرمان روائے

زین سپس بہرِ ظہورِ صاحب الامر آنکہ ہست   حامی دینِ محمدؐ قائمِ آلِ عبائے

بہرِ ارواحِ شہیدانِ زمین نینوا   آنکہ ہفتاد و دو تن بودند خاصان خدائے

سیما از بہرِ روحِ پاک عباسِ جری   بادشاہِ کربلا را بازوِ زور آزمائے

از برائے اہلبیتؑ آنانکہ در داغِ حسینؑ   داشتند از سوزِ دل آتش نفس زار زاریائے

بر روانش رحمتِ بیحد فرستد کردگار   عفو کن جرم و خطایش از سرِ لطف و عطائے

بہتم آں دارم صفی از اتحاد دوستان   جملہ اینک ہمزبانِ من شوند اندر دعائے

آہ زان روز سیاہ من کہ بے مادر شدم   وان شبِ تارِ فراقِ مادرِ غمخوار ہائے

پنجم از شوال بود و روز شنبہ وقت عصر   مادرِ من چون بفردوسِ بریں بگرفت جائے

گفتمش تاریخِ رحلت صفدری ہم معنوی
مرگش آمد در ہزار و سہ صد و دہ سال وائے

۱۳۱۰ھ

دردِ دل است قطعهٔ تاریخ نیست این

تشنه لب میر و مجو فیض ز بحرِ دنیا
کاین سراب است و بچشمِ تو نماید دریا

آسمان شکلِ حباب است و زمین نقش بر آب
ای تو گردیده وری دیدهٔ عبرت بکشا

از رهِ هوش نگر گوشش برآواز نهٔ
سازِ هستی دهد از نیستیت ورنه صدا

زینهار این نبود گرمیٔ هنگامهٔ دهر
جلوهٔ برق و شرار است بچشمِ بینا

چون بپایان برسد عمرِ خضرؑ هم هیچ است
رنجِ بیهوده مبر در طلبِ آبِ بقا

بی ثبات است جهانِ گذران ای غافل
دل بچیزی نتوان بست بجز ذاتِ خدا

رفتگان راز وجود تو نشانی پیدا است
همچو نقشِ قدم استی بگذرگاهِ فنا

اندرین راهگذر ایکه تو خوش در خوابی
هیچ دانی که نیاگانِ تو رفتند کجا

کس ندانست که منزل گه ایشان بکجاست
رفت این قافله بی گرد و ره بانگِ درا

همنشینان همه زین بزم یکایک رفتند
گوشه گیرند بکنجِ لحد اینک تنها

هم گنان رفته ز بالای زمین در زیرش
چند ایشان بقبورند که بینی این جا

جای این پاک دلان روضهٔ رضوان میباد
رَحْمَةُ اللهِ عَلَيْهِمْ وَسَلَامٌ اَبَدًا

همدرین پاک زمین مرقدِ آن مرحوم است
کاندرین وقت بود بزمِ عزایش برپا

مرکزِ دائرهٔ فضل و شرف فضل حسینؒ
قبلهٔ و کعبهٔ سیّدنا مولانا

آنکه از راهِ صفا کیشی و آزاده روی
روشناسِ همه کس بود چه شاد و چه گدا

آنکه همه در دلش وقفِ رضای احباب
آنکه در خدمتِ امرار قدش بود دوتا

آنکه پیوسته مواسای احبا میکرد
آنکه همواره بسر وقت رسیدی همه را

بذله سنجی که ز غل بود در اجای قلوب
وز لبش معنیٔ اعجازِ مسیحا پیدا

آنکه خود زندهٔ جاوید شد و در غمِ وی
مُردم ایوای ز جوششِ نفسِ سینه گرا

مطلع

بود در سایهٔ نخلیکه براحت سرِ ما   تند بادِ اجلش حیف در افگند ز پا

تازه روئی بفراقِ پدر از ما مطلب   شاخ نخلیم که برکنده شد از دستِ قضا

زنده تا بود پدر شاد بخود بالیدم   فرع را از مدد اصل بود نشو و نما

چه عجب گر بغمش قامتِ من خم بینی   سرو برکنده ز بن راست نماند برجا

چه عجب گر بغمش رنگِ رخِ من زرد است   صورتِ برگِ خزان دیده ام از شاخ جدا

بر سرِ خاک نشانید مرا مرگِ پدر   در جگر ریشه دوانید غمِ جان فرسا

همچو خنده زدن باز مجوئید از من   دارم از تنگدلی غنچه صفت برگ و نوا

کاش ای چرخ ز دستِ ستم بشکستی   زدهٔ بر دلِ من تیشهٔ سر تیز جفا

نیست زخمیکه شود چاره پذیر مرهم   این نه دردیست که باشد اثر اندوزِ دوا

کهنه شد بدلم داغِ فراقِ مادر   تازه اش کردهٔ از مرگِ پدر واویلا

گریم و خنده بهر صبح زنی یعنی چه   نه مرا صبر و تحمل نه ترا شرم و حیا

پدرم سایه فگن بود و نمی دانستم   چون سحابِ گذرانست بکشتِ دلِ ما

بوئی از گلِ تسلیم رسان باز بگوئے   بگذری جانبِ او گر ز من ای بادِ صبا

مطلع

بعدِ صحت ز مرض رفتادی از پا   چه توان کرد دگرگون نه شود حکمِ قضا

اینکه پیوسته مرا دست فگندی بر دوشش   ق   از چه در راهِ عدم پائے نهادی تنها

اندرین مرحله هم پائے خودم نگرفتی   پیر را می نه سزد دست کشیدن ز عصا

نسبت تیر و کمان بود میان من و تو   رفتی از دست و عجب اینکه بماندم برجا

بنگرم جائے تو خالیست بکاشانهٔ من   بکجا رفتی و آخر بکجائی بابا

بچه آزردهٔ آخر تو چه دیدی از من   که شدی جانبِ فرزند همین را بگرا

دل گسستی ز من و آه بپا پیوستی
من بدین رشک اگر جان بدهم دارد جا

دور افتادۀ خود را بزیارت دریاب
چشم در راه تو دارد بتمنای لقا

اقربا بهر وداع تو ببین آمده اند
نفسی چند خدا را که بکن رد بقفا

همگان بر سر بالین تو بشتافته اند
بامید یکه دل شان بنوازی بدعا

در دل است قطعهٔ تاریخ نیست این

مردمان گرد مزار تو چها صف زده اند
چشم بکشا و ببین مجمع یاران وفا

یاد بادا بسر دوش تو از منزل بود
میکشم پایهٔ تابوت تو بر دوش ایوا

بعد تو کیست که دلجوئیش از مهر کند
ای دم نزع بپای تو صفی ناصیه سا

آن جگر گوشه و دلبند تو مقبول حسین
که بهر لحظه بحالش نظری بود ترا

بیقرار است و سرش آه در آغوش نیست
بدلاسائش بفرمای چه گویم بابا

صبر تلخ است و لیکن بر شیرین دارد
نتوان داد ز کف دامن تسلیم و رضا

دوستان دست مناجات بر آرید و شوید
همزبان من دل خسته و آشفته نوا

بار الها بگنه بخشی و آمرزش خود
بگذر از جرم و خطا بخشنده لطف و عطا

سیزده سال ز صد سن شریفش کم بود
کان چراغ سحری رفت ازین تیره سرا

در عدد نقش وفا زد چو سنین عمرش
باخت از کیسهٔ هستی نفسش نقد وفا

پنجشنبه دوم از ماه ربیع الآخر
بست هنگام سحر رخت حیات از دنیا

شب آدینهٔ اول که فروغش دگر است
بسرای لحد از حسن عمل یافته جا

سال این واقعه جستند چنین گفت صفی
آه رفته به چمن زار ارم والد ما

۱۳۱۷ھ

مرثیهٔ کامل جنت نشین

ترکیب بند

بند اوّل

بقای عمر بدورِ زمان چه می جوئی — ثباتِ نقش بر آبِ روان چه می جوئی
بنای خانه کجا و کجا گذرگهِ سیل — دریں خرابه ز منزل نشان چه می جوئی
قرارگاه تو آمد نشیبِ لاخِ لحد — ز هر کاخِ بلند آستان چه می جوئی
کشای بال و پرای طائرِ نشیمنِ قدس — بدامگاه بلا آشیان چه می جوئی
غبارِ فتنه بلند است چار سو بنگر — تو جای امن درین خاکدان چه می جوئی
ز سرِ زمینِ لحدگاهِ خود نه آگاه — تو رازِ پردهٔ هفت آسمان چه می جوئی
ترا که رختِ کفن ستر پوش خواهد شد — لباسِ خود ز خز و پرنیان چه می جوئی
ز حق بجوی چو جویای ننگ و نام استی — تو کامِ خویشتن از این و آن چه می جوئی
ز روحِ کالبدِ ما بود گرامی قدر — نماند جان ز تنِ ناتوان چه می جوئی
گسسته دامِ تعلق همای اوج گرای — بخاک ریختهٔ استخوان چه می جوئی
تو خود چو گوش بر آوازِ الرحیل استی — سراغِ قافلهٔ رفتگان چه می جوئی
ترا چو عاقبتِ کار بے نشانیهاست — نشانِ مرقدِ نام آوران چه می جوئی
نشانِ دوست نه بینی که هر طرف پیداست — درین خطیره بهر سو دوان چه می جوئی
بر اکثرے ز قبورش نوشتها یابی — مزارِ کاملِ معجز بیان چه می جوئی

بداغِ او دلِ ما غم کشان باید سوخت
که صد چراغِ سخن بر مزارها افروخت

بند دوم

سخنوری که سخن‌هائے دلکشا می‌داشت / دماغِ روشن و اندیشهٔ رسا می‌داشت

خوش نشسته بکنجِ تفکرِ شعر و سخن / خیالِ او سرِ گردون بزیرِ پا می‌داشت

ز نثرِ سهل ترک می‌شمرد گفتنِ شعر / ببین که دستگهِ نظم تا کجا می‌داشت

اگر غلط نه کنم بود صائبِ در ہند / که از مقامِ صفاہان لبش نوا می‌داشت

بروئے جلوه پرستانِ شاہدِ معنی / در صنم کدهٔ حسن و عشق وا می‌داشت

دلش بر اہلِ جہان پشتِ دست افشانده / زمانه سوئے درش روئے التجا می‌داشت

گہے نگشت ہراسان ز سختیِ دوران / بکار و بارِ خودش تکیه بر خدا می‌داشت

مگو که بود تہی‌دست ہمتش از زر / از آنکه ہر سخنش قیمتِ طلا می‌داشت

گہرفشان قلمش سر به ابر نیسو دے / ولے ز روئے تواضع قدش دوتا می‌داشت

به تنگنائے جہان خوش نبود روزے چند / کشاکشِ مرضش در شکنجه‌ہا می‌داشت

چنان ز طولِ مرض ناامیدِ صحت بود / که زیرِ لب سخنِ صبر آزما می‌داشت

بخاک رفتِ سبکبار و جمله داد بباد / ہر آن متاع که با خود گرانبہا می‌داشت

گذشت و آه ز خود جز سخن نشان نگذاشت
ولے ذخیره توان کردنش جہان نگذاشت

بند سوم

بزیرِ خاک تنے ہیچو یاسمین دیدیم / ذخیرهٔ ز کمالات در زمین دیدیم

تنے که بارِ گلے بر نتافت در خاک است / بدورِ چرخِ چنان گاه این چنین دیدیم

بخاک رفت چو سر حلقهٔ سخن سنجان / بدہر خاتمِ اندیشه بے نگین دیدیم

دمِ نظارهٔ او چشمِ دل شدے روشن / فروغِ کا در آئینهٔ جبین دیدیم

چه حرفہا که ز لعلش نه جان نواز آمد / چه نقشہا که ز کلکش نه دلنشین دیدیم

گر از خوان کمالش نیافتیم مگس — گر از خرمن فضلش نه خوشه چین دیدیم
بصفحهٔ چمن نامه اش نزد قدمے — که خامه را گلِ معنی در آستین دیدیم
همین بس است پئے فخرِ ما که در یک سلک — بگوهرش گهرِ خویش همقرین دیدیم
ز قدر و قیمتِ ما هر که داشت آگاهی — برفت و آه چها در غمش ببین دیدیم
نهان بپردهٔ ظلمت چو ماهِ کامل شد — بگاهِ دفن میرزا انچه هم نگین دیدیم

ز دل بدیدهٔ تر جوئے خون روا کردیم
بهجرِ کامل خود اینچنین فغان کردیم

بند چهارم

فغان که ملکِ سخن را نماند شاهنشاه — بچشمِ نکته وران شد جهانِ نظم سیاه
فغان که گنجِ معانی بخاک پنهان شد — طلسمِ زندگیٔ دل شکست اجل ناگاه
فغان که رفت گرانمایه شاعرے از دهر — که کرد گوهرِ معنی نثار شام و پگاه
فغان که در طلبِ دولتِ سخن هرگز — گهے ندید کسے دستِ همتش کوتاه
فغان که پائے گرانش سبک و جا برخاست — شکستنِ دلِ ما هم نگشت شیشهٔ راه
فغان که شمعِ حیاتش که بود بزم افروز — گداخت آخرِ کار از حرارتِ جانکاه
فغان که رختِ سفر بست در چنین هنگام — که جنبشے نتوانست هم زبانے نگاه
فغان که بود برگش قیامتے برپا — ز شورِ نالهٔ و شیون میان منزل گاه

میرزا اینکه عزیزان جهان بسر کردند
بدرد و غم شبِ اندوه را سحر کردند

بند پنجم

سحر که خاطرِ آفاق را بهم زده است — مگر ز چاکِ گریبانِ صبر دم زده است
مرا ز چرخِ جفا پیشه صد شکایتهاست — چه طعنه ها که نه بر گشتهٔ ستم زده است

گرانبہا زرِ کامل عیار بردہ زکف | بہر دل آتشِ جانسوز بیش و کم زدہ است
ز بست و ہشتم ذیقعدہ ماہ صبح دمید | ولیک تیرہ از شام گاہ غمزدہ است
بلند مرتبہ سید علی میاں کاملؔ | ہزار حیف قدم در رہِ عدم زدہ است
برائے لوحِ مزارش صفیؔ بخون جگر | ز سالِ رحلتِ او مصرعے رقم زدہ است

مکن عجیب فغانش زدان بمجلسِ خُلد
رسیدہ کاملِ معجز بیان بمجلسِ خلد

سنہ ۱۳۲۲ھ

نوٹ

یہ مرثیہ لسان القوم سید علی نقی صفیؔ لکھنوی نے مولوی سیّد علی میاں صاحب کاملؔ علی اللہ مقامہ کی وفات پر نظم کیا تھا جو فل اسکیپ سائز کے چار صفحوں پر جناب واجد حسین عرف گلشن صاحب کے زیر اہتمام مطبع گلشنِ فیض، مولوی گنج، لکھنؤ سے شائع کرا کے تقسیم کیا گیا تھا۔

قطعہ تاریخ

اے آنکہ در فراقت دلہا ہلاکِ شیون
خُلقِ ترا معترف از دوست تا بدشمن

ہے ہے نیم شب کہ رفتی روز سیاہ آمد
کین تیرہ خاکدان را بودی چراغ روشن

آخر چہ شد کہ از ما آزردۂ خدارا
در گوشۂ ز خلوت بگرفتۂ نشیمن

ماہ جمادی الاولیٰ افسردہ کرد مارا
کز خارزارِ ہستی رفتی کشیدہ دامن

بر روئے دوستانت بستی درِ زیارت
در حجرہ جا گرفتی خود درمیانِ گلشن

در لکھنؤ ازین رہ نقلِ مکان نمودی
تا ارضِ کربلایت سازد خدائے مدفن

مائیم و اشک ریزی مائیم و نالہ خیزی
مائیم و خاک ریزی درتوے کوئے وبرزن

اے آسمان خدارا رحمے بحالِ زارم
دارم دلے زدۂ غش چون شعلہ تابِ گلخن

چشمم ز اشک ریزان خرمن زند ز آتش
اہم ز برقِ سوزان آتش زند بہ خرمن

ہر جا دلیست بینم خون گشتہ در غمِ او
سازم بتلخیٔ غم۔ غم می گزد دلِ من

ہان سرخوشانِ دولت در شاہراہِ ہستی
از آسمان بترسید این رہبرست رہزن

طرزِ جگر بدانید آئین و شیوۂ او
در کوئے نیک نامی دارید پائے رفتن

در کف عنانِ دولت آرید آرے آرے
مستانہ اش متازید این است شوخ توسن

بصرفہ نقد جان ہم بگرفت آہ از وے
گردونِ ناسزا را خون جگر بگردن

کلکِ صفی رقم زد مصراعِ سالِ رحلت
مرزائے ما محمد عباس خلد مسکن

١٣٢٨ھ

نوٹ:۔ یہ قطعہ مرزا بہادر محمد عباس علی خاں صاحب جگر مغفور، رئیس لکھنؤ (اودھ) کے انتقال پر کہا گیا تھا اور مجلس سوم میں جو ۱۶ رمئی ۱۹۱۰ء کو منعقد کی گئی تھی صفی لکھنوی نے خود پڑھا تھا۔

قطعۂ تاریخ

نوشین دہنِ نیش زنان از سخنِ من
زنبورِ عسل می مکد اندر چمنِ من

لذت کشِ درد آمدہ ہر جزوِ تنِ من
دلِ خون شود و می دود اندر بدنِ من

بیگانہ ام از خویش ز وارفتگیٔ خود
غربت زدۂ نیست چو من در وطنِ من

حاصل شدہ کامِ دل و گم رشتۂ عمرم
آب زدہ در دل و ز کف شد رسنِ من

بر چاکِ جگر بخیہ زنم زانکہ بیفتد
زخم از سرِ نو بر سرِ زخمِ کہنِ من

شک نیست بشیرینیٔ جان لیک ز من پرس
شہد است کہ زہر است بکامِ دہنِ من

گر چاشنیٔ نظم خوشش آید بند وقت
زین مثنویم گیرد عیارِ سخنِ من

بہ طرزِ غزل قطعۂ تاریخ نوشتم
ہاں خردہ مگیرند حریفانِ فنِ من

پیداست ازین سالِ مسیحی دمِ اتمام
قنداب صفیؔ شد ز حلاوت سخنِ من

۱۸۹۳ء

نوٹ:۔ یہ قطعۂ تاریخ صفیؔ لکھنوی نے اپنی مثنوی "قنداب" کے لیے لکھی تھی۔ ان کے شاگردوں نے بھی "قنداب" پر قطعاتِ تاریخ نظم کیے تھے۔ یہ تمام قطعات مثنوی کے ساتھ شائع ہو چکے ہیں۔

ذکرِ ناصری

ناصری پہلے تو ہر دل میں کیا آپ نے گھر — پھر چلے سب سے خدا حافظ و ناصر کہہ کر
آپ کے فضل و کمالات کی ہو کیا توصیف — ایک اک وصف کو درکار ہے اک اک دفتر
موعظہ کی ہو جو مجلس تو وہاں واعظ آپ — آپ ذاکر جو ضرورت ہو برائے ممبر
آپ بے مثل سخن سنج اگر ہو جلسہ — آپ مشّاق مقرّر جو کہیں ہو لکچر
آپ نقّادِ سخن بھی ہیں سخنور خود بھی — نثر میں نظم میں ہر صنف میں پایہ برتر
فلسفی بھی ہیں مورّخ بھی ہیں ماشاء اللہ — ایک گلدستہ ہر اک رنگ کے حسیں گلِ تر
شوق تصنیف سے بھی ذوق ہے تالیف سے بھی — ماہرِ السنۂ مختلفہ نام آور
انگریزی عربی فارسی اُردو میں تمام — امتحاں پاس کیے سب کے مسائل ازبر
سیکھ لی چند ہی روز میں زبانِ جرمن — جو ہے یوروپ کی زبانوں میں زباں مشکل تر
خطِ روشن کا ہر اک دائرہ بینش افزا — تیرہ دل کور سوادوں کے لیے کحل بصر
حُسن میں روکشی ابروئے حسینان مدات — پیچ و خم سطر پا زلف سیاہ دلبر
نکتہ نکتہ صفتِ خالِ بتانِ مہوش — سبق آموزِ دلِ افروز معانی گستر
دیکھیے سر سے قدم تک تو مجسم اخلاق — صاف سودائے محبت سے خمیر پیکر
مشکِ خالص کی طرح غالیہ سا خلق عمیم — دلِ اخلاص گزیں مہر و وفا کا خوگر
دیکھنے میں تو تن و توش سے بھاری بھر کم — نفس مرتاض مگر زہد و ورع سے لاغر
جیسے شاخِ ثمر افشاں متواضع ایسے — خندہ رُو وقت سخن جیسے شگفتہ گلِ تر
جلوہ گر شوخ نگاہوں سے صفائی دل کی — حدّتِ ذہن کے تابع تپشِ برقِ نظر
حُسنِ کردار سے پبلک بھی گورنمنٹ بھی خوش — سارے ماتحت بھی خوشنود رضامند افسر

ماڈل ٹیچر ہیں کہیں اور کہیں ممتحن آپ — کہیں فیلو عملاً مختلف آثار ہنر
ہے کوئی دوسرا ایسے دماغ و دل کا — کیوں نہ ہوں ہر دولی دائرہ میں یہ میسر
ایسی تحریکیں ہیں صدہا یہ محرک جن کے — ایسی تائیدیں ہزاروں جو محول ان پر
قحط ہیڈ ماسٹروں کا نہیں کچھ صوبہ میں — جامعیت کے مگر ایسے ملیں گے کمتر
ساتھ اس حسنِ لیاقت کے وسیع الاخلاق — ہر نگہہ سُرمہ تسخیر کا گویا جوہر
ہر جگہ آپ سے ہندو بھی مسلماں بھی خوش — بشریت کا تو جامہ مگر اس پر بے شر
اپنے ماتحتوں سے ہر وقت مساوی برتاؤ — خالی اندازِ تحکم سے محبت کی نظر
مُلک و ملت کے لیے فیض رساں بحرِ کرم — جس سے جُز نفع کسی کو کبھی پہونچا نہ ضرر
گئے ہیڈ ماسٹر اسکول کے ہو کر یہ جہاں — کامیابی کا وہاں سہرا رہا اُن کے سر
یہ اُسی خلق و مروت کا نتیجہ سمجھو — بیشتر کیا تھا اب کیا ہے طلبا کا منبر
صورتِ مردمکِ چشم یہ خود خانہ نشیں — جملہ طلاب کے حالات مگر پیش نظر
ہم نے دیکھا ہے عموماً طلبا صورتِ بید — کانپتے رہتے ہیں ہیڈ ماسٹروں سے اکثر
ایسی ہیڈ ماسٹری ہے کوئی ہیڈ ماسٹری — اثر انداز ہو بچوں پہ جو ہوا ایسی کر
ان سے سیکھے کوئی اندازِ محبت کے اصول — موم کر دیتے ہیں ہر چند کہ دل ہو پتھر
خود یہ ٹینس میں شریک طلبا رہتے ہیں — کہ وہ مانوس ہوں دل میں رہے نہ خوف و خطر
ویسے استاد سے کیونکر نہ ہو سب کو اُلفت — شفقت کرتا ہو شاگردوں پہ جو مثلِ پدر
ہائی اسکول میں یہ آ کے رہے اتنے دن — بارہ بنکی ہے ترا ضلع بڑا قسمت ور
سنگ ریزوں کو جواہر جو بنا دیتا تھا — وہ گیا تجھ کو مبارک ترے لعل و گوہر
ابھی کیا خیر کبھی یاد کرے گا اس کو — گُل کھلائے گا نئے جب کہ سپہر اخضر
مختصر یہ ہے کسی کو نہیں دنیا میں قرار — سب ہیں گردش میں نجوم فلک و شمس و قمر
گردشوں سے کرۂ ارض کی حالت یہ ہے — کہ یہاں شام اگر ہے تو کہیں اور سحر

سلسلہ ہیں حوادث کا ہے یا میل ٹرین　　متغیّر ہے جہانِ گزراں سر تا سر

اتفاقی ہے یہ احباب کا ملنا جُلنا　　جس طرح گاڑیوں میں آئیں نظر بے سنجر

قابل قدر وہی فرد ہے انسانوں میں　　چھوڑ کر جائے دلوں پر جو محبت کا اثر

شاندار آج کا جلسہ یہ بتاتا ہے صفیؔ　　منحصر ہیں قلوب مست اثر کیونکر

ڈبڈبائی ہوئی آنکھیں ترنم لب شوق　　کیفیت رنج و مسرت کا بہم شیر و شکر

میزباں کل تھا جو دیکھو وہی مہماں ہے آج
ایک عبرت کا سماں ہے یہ موثر منظر

نوٹ:۔ جناب شیخ مہدی حسین ناصری ایم۔اے کا تبادلہ بارہ بنکی سے گورنمنٹ اسکول علی گڑھ بحیثیت ہیڈ ماسٹر ہو گیا تھا۔ ناصری مرحوم لکھنؤ کے ادیبوں میں بہت مقبول ہو چکے تھے۔ شاعری میں صفیؔ لکھنوی کے شاگرد تھے۔ ناصری مرحوم کی ہر دلعزیزی کی بنا پر اُن کے ہمعصر اور دوست شیخ ممتاز حسین جونپوری نے ایک الوداعیہ دیا جس میں شہر کے معروف ترین ادبا اور شعراء نے شرکت کی۔ اور اپنے انداز میں ہر ایک نے ناصری مرحوم کی مدح سرائی کی۔ صفیؔ لکھنوی نے بھی یہ نظم پڑھی تھی۔

خطوطِ بیخود

KHATUT-E-BEKHUD (A collection of Urdu letters penned by "BEKHUD MOHANI) edited by SYED Z. H. KAZMI

In this short yet compact volume, the learned editor Mr. Kazmi has incorporated in a systematic manner 28 well chosen iitersry letters in chaste under which Syed Mohd. Ahmad 'BEKHUD' Mohani, an eminent Urdu Poet of his times wrote to Professor Syed Masood Hasan Rizvi 'Adib', an Urdu and Persian Scholar of international fame and to SYED ALI ABBAS Husaini, a great Urdu Novelistl end short story wrirer.

All the 28 letters included in the volume are indeed of high literary merit. They are master pieces of Urdu Language. By publishing these letters Mr. Kazmi has certainly done a signal service to the promotion of Urdu literature in this country.

A perusal of these letters by 'BEKHUD' Mohani shows what great Command he yielded over Urdu language and how he has tried to develop an inimitable style of his own by following the Path troden by late Mirza Ghalib in his own writikgs. These letters have depicted a realistic picture of the age in which the letter writer lived. They also portway the cardial and intimate relationseip that subsisted between 'BEKHUD' Mohani and the learned Professor 'Adib'. Most of the letters comsrise of poetic lines composed by either 'BEKHUD' Mohini himself or by other poets. One of the letters which contains the appeal of a deposed Household Sectetary of Maharaja JAIPUR penned in exquisite poetry provides very pathetic affair which is very touching as well as appealing to the heart.

Mr. Kazmi's short yet comprehensive 'preface' is a remarkable piece of writing in as much as it traces the trend of the art or letter-writting in Urdu language from the earlist times to the present day. It undoubtedly presents a Miniature History of 'Urdu letters' to the readers.

The book also containes sketches of the outstanding and inspiring lives of 'BEKHUD' and 'Adib'. The text of the book has also been clarified and made easily intel.igible by profuse foot-notes appended by the editor on almost every poge of the book.

This scholarly and unique publication is sured to be welcomed as a notable addition to Urdu literature. It well deserves an honoured place in the selves of all public and private Litberaries in this country where Urdu books of a high standerd like the present one are stocked and treasured for the use of Posterity, the present and future researh workers and scholars of urdu literature. We felicitate the editor of this valuable production.

(The "Pioneer" daily, April 10, 1977).